جلد ۷۱ مارچ ۱۹۶۹ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

زر سالانہ: سات روپے

فی پرچہ: ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	مارچ ۱۹۶۹ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ	جلد ۷۱

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	۵۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان پچھلے چند مہینوں میں جس صورتِ حال سے دوچار رہا ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی سطح بین آنکھ کے لیے کوئی اتفاقی حادثہ یا وقتی ہنگامہ آرائی ہو مگر جو لوگ اجتماعی معاملات کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں ان کے لیے وہ کسی اعتبار سے بھی اَن ہونی بات نہ تھی بلکہ سب کچھ اُس آمریت کا بالکل فطری نتیجہ تھا جو گذشتہ دس سالوں سے اس ملک پر بُری طرح مسلط چلی آ رہی تھی۔ فوج کے خوف، پولیس کے تشدد، پریس اور پلیٹ فارم پر قدغن اور آمرانہ قوانین کی جکڑ بندیوں کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی سطح پر اس عرصے میں بظاہر سکون دکھائی دیتا تھا لیکن ہر صاحبِ بصیرت انسان سطح کے نیچے چلنے والی تہ بہ تہ ہیجان کو دیکھ کر اس کی تلاطم خیزیوں کا اچھی طرح اندازہ کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے یہ چیز قطعاً اوجھل نہ تھی کہ اجتماعی زندگی میں استبداد اور تشدد کے ذریعے پیدا کیا ہوا سکون کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمیشہ کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اِن اصحابِ فکر و دانش کا ان خدشات کے بارے میں اندازہ کسی لمبی چوڑی تحقیق اور کسی غیر معمولی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ نوامیسِ فطرت کی معمولی واقفیت، تاریخ انسانی کا سرسری جائزہ اور روزمرہ کے واقعات کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ اس آنے والے طوفان کی صاف نشاندہی کر رہا تھا۔ جب بے جان اشیاء کو دبانے سے بھی ایک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ ذی روح اور ذی شعور انسان کو دبانے سے کوئی ردِ عمل رونما نہ ہو۔ جابرانہ اور حاکمانہ حکومت کسی کی زبان پر پہرے بٹھا سکتی ہے، کسی کے قلم پر قدغن لگا سکتی ہے، کسی کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کر سکتی ہے، مگر اس کے نتیجے میں انسان کے قلب و دماغ کے اندر اضطراب کی جو لہریں اٹھتی ہیں اُن پر کوئی تسلط قائم نہیں کر سکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی فرد یا معاشرے پر ظلم ہو رہا ہو تو وہ سنگینوں کی دہشت سے مہر بلب رہے

اور ظلم کے خلاف زبان سے فریاد نہ کرے، مگر دل کی فریاد کو آخر کیسے روکا جا سکتا ہے ؎

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

تاریخ کا یہ نہایت واضح اور دو ٹوک فیصلہ زمانے کی لوح پر پوری آب و تاب سے ثبت ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا طبقہ زیردست آزاری کو اپنا مشغلہ بناتا ہے اور چالاکی اور عیاری یا جبر و تشدد کے ذریعے عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرتا ہے تو پھر اس کے زوال کو کوئی بڑی سے بڑی ارضی قوت بھی نہیں روک سکتی۔ انسان جب چند بے جان سکوں سے ناجائز طور پر محروم ہونا گوارا نہیں کر سکتا تو وہ اپنے بنیادی حقوق کو جو درحقیقت اس کی انسانیت کا جوہر ہیں کس طرح تیاگ دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ انسان کے خمیر میں ظلم و استبداد کے خلاف نفرت اور ناانصافی اور استحصال کے خلاف غصے کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور واقعات کے پیچھے جھانک کر ان کے اصل محرکات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانیت کی پوری تاریخ ظلم اور ناانصافی کے خلاف طویل جدوجہد کی بڑی عبرتناک داستان ہے۔ جن معاشرتی زلزلوں کو ہم انقلابات کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان کی حقیقت آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ ستم زدوں نے ایک مدت دراز تک ستمگروں کے ظلم و ستم سہنے کے بعد آخرکار استبداد کے خلاف آواز بلند کی اور چیخ پکار کر یہ بات ان کے ذہن نشین کرائی کہ خدا نے انہیں آزاد پیدا کیا ہے، انہیں غلام نہ بنایا جائے۔ قادرِ مطلق نے کائنات کا پورا نظام حق و انصاف کی بنیاد پر قائم کیا ہے اس لیے ان کے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے۔ ربّ العزت نے انہیں اشرف المخلوقات کی حیثیت سے اس کرۂ ارضی پر اتارا ہے، ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک نہ کیا جائے۔ انسان محض انسان ہونے کی بنا پر اسی عزت و تکریم کا مستحق ہے جو اس کے مصنوعی آقاؤں نے اپنے لیے مختص کر رکھی ہے۔ مالک الملک نے انسانیت کا تاج کسی مخصوص فرد یا گروہ کے سر پر نہیں رکھا ہے بلکہ سارے انسانوں کو اس سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس بنا پر کسی شخص یا طبقے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمائے۔ کبریائی صرف خدائے واحد کو زیب دیتی ہے

انسانی کبریائی کی یُوں تو متعدد صورتیں ہیں لیکن اس کی ایک معروف صُورت آمریت ہے۔ علمائے سیاست و تاریخ نے اس کی کئی تعریفیں بیان کی ہیں مگر اس کا نہایت صحیح مفہوم "جھوٹی خدائی" کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی فرد انسانیت کے دائرے سے نکل کر اپنے آپ کو خدائی کے بلند مقام پر فائز کرنے کی کوشش کرے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان غلط خیالات اور عزائم کے ساتھ اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والا شخص نمرود، فرعون اور شداد کی طرح زبان سے بھی خدائی کا دعویدار ہو۔ جھوٹی کبریائی کی شان "خادمِ قوم" ہونے کے زبانی اعلانات کے ساتھ بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ اصل چیز دعویٰ نہیں بلکہ وہ اندازِ فکر اور وہ طرزِ عمل ہے جو ایک انسان یا گروہ اولادِ آدم کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔

اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی سب سے بڑی نمایاں علامت یہ ہے کہ کوئی آدمی اتفاقاً اقتدار پا کر اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لے کہ اس کی سوچ ہر عیب سے پاک اور اس کا عمل ہر خامی سے مبرا ہے۔ اسے خالق نے ایک ایسا صحیح اور رسا ذہن عطا کیا ہے جس میں کبھی کوئی غلطیاں راہ نہیں پا سکتی۔ اس لیے وہ جو کچھ سوچتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہی سو فیصد صحیح و برحق ہے اور لوگوں کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے کے سوا کوئی دوسرا طرزِ عمل درست نہیں ہے۔ یہ بنیادی غلطی پھر بہت سی دوسری غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ چونکہ اس سے غلطی کا صدور ممکن نہیں ہے اس لیے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی کسی بات پر یا اس کے کسی کام پر حرف گیری کرے۔ جو لوگ اس قسم کی جسارت کرتے ہیں وہ یا تو احمق اور بے وقوف ہیں کہ عقلِ کل شخصیت کے عزائم کی حکمتوں کو سمجھ نہیں پاتے، یا پھر ان کی نیت میں فساد ہے کہ وہ بھلائی اور خیر خواہی کے کاموں میں بلاوجہ کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔

اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پُوری قوم کی قوت ایک ہاتھ میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ کچھ اس نہج پر تشکیل پاتا ہے کہ بزعمِ خود روشنی کے ایک مینار کے سوا باقی ہر جگہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک اور قوم کے اندر حق و صداقت، اخلاص اور دردمندی، فہم و تدبر اور انسانی خیر خواہی کا سرچشمہ صرف ایک ذات ستودہ صفات ہے اور اس ایک سرچشمے کے سوا باقی ہر جگہ نفاق، نادانی، اور عاقبت نا اندیشی کی غلاظتیں جمع ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام نہ صرف ایک

ذات کی طرف دیوانہ وار لپکیں بلکہ جو اس معاملے میں ذرا متامل نظر آئے یا اس فضا میں دانشمندی اور ہوشمندی کی بات کرے اُسے ملک و ملت کا دشمن باور کرایا جائے۔ یہ صورتِ حال پیدا کر کے آمر پوری طرح اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جن افراد یا گروہوں کو اپنے اقتدار کے لیے کسی لحاظ سے بھی خطرہ سمجھتا ہے انہیں یا تو قوت کے بل بوتے پر ختم کر دیتا ہے یا انہیں عوام کی نظر میں اتنا بے وزن بلکہ ذلیل بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ معاشرے میں ان کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ ان کے خلاف اتنی بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں کہ وہ بیچارے حکمرانوں کی غلطیوں پر ٹوکنے اور متنبہ کرنے کے بجائے اپنا بیشتر وقت ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے ہی میں صرف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جس طرح بڑکا درخت وسیع و عریض رقبے کی ساری غذائیت چوس کر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ برومند کرنے اور پھیلانے کی کوشش کرتا ہے بالکل اسی طرح آمریت پوری قوم اور ملک کی توانائی چوس کر اپنے لیے غیر معمولی قوت کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور اس امر کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ اس کے اقتدار کا سایہ اتنا پھیل جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہ رہے۔ وقتی آرام اور سکون کے طلبگار اسے ایک نعمت خیال کرتے ہیں مگر سوچنے والے دماغ اور مشاہدہ کرنے والی آنکھ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہوتا کہ جو درخت زمین کی ساری غذائیت کشید کر کے غیر معمولی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے اردگرد تو کیا بلکہ دور دور تک کسی دوسرے درخت کو پھلنے پھولنے کے سارے مواقع سے محروم کر دیتا ہے اس بنا پر اس کے قریب سوائے جھاڑ جھنکار کے اور کوئی چیز اُگنے نہیں پاتی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ کوئی درخت غذائیت کے سمیٹنے اور اپنے سائے میں وسعت پیدا کرنے کے معاملے میں جس قدر حریص ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کے برباد ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی اس کی توانائی ختم ہونی شروع ہو جاتی ہے اور اس کے لیے خود اپنا بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں اتنی لاغر اور کمزور ہو جاتی ہیں کہ ایک ہلکا سا طوفان اس کے دیو پیکر ڈھانچے کو بڑی آسانی کے ساتھ پیوندِ خاک کر دیتا ہے۔ اُس وقت اس کے سائے میں آرام کرنے والے بے فکرے اور عاقبت نااندیش لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور انہیں دفعتہً اس تلخ حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے اب ان کے پاس کوئی دوسرا سہارا باقی نہیں رہا۔

آمریت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اس بڑ کے درخت کی طرح اپنے سامنے کسی متبادل قیادت کو اُبھرنے نہیں دیتی۔ اس کے ارد گرد جو لوگ بھی جمع ہوتے ہیں ان کی حیثیت گھاس پھوس سے زیادہ نہیں ہوتی جن کا آمر جس وقت چاہے بڑی آسانی سے استعمال کر سکتا ہے، اور جب بھی وہ ان میں سے کسی کو اکھاڑ پھینکتا ہے تو عوام خس کم جہاں پاک کہہ کر دل کی گہرائیوں میں ایک گونہ اطمینان محسوس کرتے ہیں، کوئی آنکھ اس کی بربادی پر پُرنم نہیں ہوتی۔

آمریت کو ہر وقت اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ آمر کی شخصیت کے سوا پورے ملک میں کوئی دوسرا شخص ایسا باقی نہ رہے جس کی طرف لوگ امید اور اعتماد کی نظر سے دیکھیں، جو کبھی عوام کی توجہ کا مرکز بن سکے، اور جس سے لوگ یہ توقع رکھ سکیں کہ وہ بھی ملک کے معاملات کو چلا سکتا ہے۔ چنانچہ نشر و اشاعت کے سارے ذرائع لوگوں کے اندر یہ تأثر پھیلانے میں صرف کیے جاتے ہیں کہ قوم اور ملک کا اصل کارساز صرف ایک ہی ہے اور اجتماعی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے جو لوگ بھی اس سے ذرا الگ انداز میں سوچتے ہیں وہ سارے کے سارے نالائق اور خود غرض اور قوم کے لیے غارتگر ہیں۔ اس تأثر کو لوگوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح راسخ کرنے کے لیے جہاں ایک طرف آمر کی ہر بات کو بڑی مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے ساتھ عوام میں اُچھالا جاتا ہے وہاں اس بات کا بھی پوری طرح اہتمام ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا فرد یا گروہ عوام کے اندر اپنا کوئی اثر و رسوخ نہ پیدا کر سکے۔ اس مقصد کے لیے بڑے ذلیل اور اوچھے حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ نشر و اشاعت کے سرکاری ذرائع تو خیر برسرِ اقتدار شخصیت کی مدح و توصیف کے لیے وقف ہوتے ہی ہیں، مگر اس کے ساتھ اس بات کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی ایسے پریس کو پنپنے اور کسی ایسے پلیٹ فارم کو زندہ رہنے کا موقع نہ دیا جائے جو آمر کی ذات کے علاوہ کسی دوسری شخصیت کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ثابت ہو۔ اس غرض کے لیے تقریر و تحریر کی آزادی سلب کی جاتی ہے اور سیاسی سرگرمیاں تو ایک طرف رہیں اُن انفرادی سرگرمیوں کو بھی ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کیا جاتا جنہیں برسرِ اقتدار طبقہ اپنے مفاد کے کسی طرح بھی منافی سمجھتا ہو۔ قوم کو مختلف انداز اور اسلوب کے ساتھ ہمیشہ یہ درس دیا جاتا ہے کہ اگر زبان کھولو تو صاحبِ اقتدار کی ثنا خوانی میں کھولو ورنہ خاموش رہو، اگر قلم کو حرکت دو تو صرف اس کی مدح سرائی کے لیے، ورنہ اسے توڑ دو، اگر کوئی سرگرمی جاری رکھو تو اسے صرف اس غرض سے جاری رکھو کہ اقتدار کی قوت اور عظمت میں اضافہ ہو، ورنہ خاموشی کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرو۔

معاملہ پروپیگنڈے کے ذریعے صرف "واحد نجات دہندے" کی عظمت کا نقش عوام کے دلوں پر بٹھانے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اُن سب حضرات کو اجتماعی زندگی کے میدان سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے متعلق یہ معمولی سا شائبہ بھی ہو کہ وہ ملک کے اجتماعی معاملے میں کبھی کوئی مؤثر قوت بن سکتے ہیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے ان کمزور افراد کو تلاش کیا جاتا ہے جو دولت وعزت اور منصب وجاہ کے لالچ میں ضمیر کا سودا کرنے پر تیار کیے جا سکیں اور ان لوگوں کو اُن کی مناسب قیمت ادا کر کے اقتدار کی رتھ میں جوت لیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو خوف اور دہشت کے ذریعہ خاموش کرنا ممکن ہوتا ہے ان کے معاملے میں اسی نوعیت کے اخلاق سوز حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جنہیں کوئی لالچ اور خوف حق وصداقت کے راستے سے ہٹا نہیں سکتا ان کے خلاف نہایت مکروہ اور گمراہ کن پروپیگنڈا کر کے ان کے مُنہ پر سیاہی ملنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ عوام کو اپنا مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں اور عوام یہ باور کر لیں کہ ملک میں روشن ضمیر صرف ایک ہی ذات ہے اور اس کے مقابلے میں ہر دوسری شخصیت خائن، غدار، ملک وقوم کی دشمن اور فہم وتدبر سے عاری ہے۔ اس کا اثر صاف ظاہر ہے کہ قوم ہر طرف سے مایوس ہو کر صرف ایک شخصیت کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ وقتی طور پر آمریت کو اس کا بہت فائدہ پہنچتا ہے مگر اس خود غرضانہ اور عاقبت نااندیشانہ طرزِ عمل سے قوم میں قیادت کا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ پوری قوم قیادت کے اعتبار سے بالکل بانجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور صاحبِ اقتدار کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے جب اس کے گرد پھیلے ہوئے طلسمات ٹوٹتے ہیں تو عوام پر شدید قنوطیت اور مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے محرومی کے ایک ایسے افسوسناک مقام پر پاتی ہے جیسے کوئی پیاسا مسافر پانی کی تلاش میں تپتے ہوئے صحرا کی طویل اور صبر آزما مسافت طے کرنے کے بعد آبلہ پا پہنچے اور وہاں اس پر یہ تلخ حقیقت اچانک آشکارا ہو کہ وہ مقام جو دور سے اس کی نظروں کے سامنے اُبلتے ہوئے چشمے کا خوش کن منظر پیش کر رہا تھا وہ سراب تھا۔ اضمحلال مایوسی اور ناامیدی کے اس عالم میں لوگ غلطی سے یہ فرض کر بیٹھتے ہیں کہ یہاں ہر جگہ دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ یہاں خلوص کا کوئی ایک چشمہ بھی نہیں۔ یہاں جس طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے مکر وفریب کے چمکتے ہوئے ذرات ہی پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کی قوم اخلاص وشرافت سے یکسر محروم ایک لق ودق صحرا ہے جس میں دور دور تک انسانی ہمدردی کا کوئی نخلستان نظر نہیں آتا۔ جب کسی قوم کے اندر اپنی قیادت کے بارے میں اس قسم کے

مایوسی کن احساسات پیدا ہو جائیں تو پھر دُنیا کی کوئی قوت اسے اضمحلال اور انتشار سے نہیں بچا سکتی۔ اس کے ہاں نفسا نفسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ افراتفری کے عالم میں شُتر بے مہار کی طرح جس طرف چاہتی ہے بن سری اور منہ زور ہو کر دوڑ پڑتی ہے۔

بد قسمتی سے اس وقت پاکستان اُن ساری بربادیوں کا بھیانک نقشہ پیش کر رہا ہے جو آمریت اپنے جلو میں لازمی طور پر لاتی ہے۔ اس ملک کو صرف ایک فرد کی جولانگاہ بنا کر باقی ہر اس فرد یا گروہ کو آمرانہ قوانین اور آرڈیننسوں کے ذریعے مُشکیں کس کر بے بس بنا دیا گیا جو ملک کے اجتماعی معاملات میں کسی طرح بھی دخیل ہو سکتا تھا۔ ان حالات سے ہر طالع آزما نے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ زرداروں نے آمریت کی تائید اور حمایت سے مُلکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹا اور بالکل بے خوف ہو کر غریبوں پر ظلم ڈھائے اور محنت کشوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کیا۔ سرکاری افسروں نے آمریت کے زیرِ سایہ اپنے آپ کو عوامی بازپرس سے یکسر محفوظ و مامون سمجھتے ہوئے کمزوروں پر عرصۂ حیات تنگ کیا اور خدا اور خلق سے بالکل بے نیاز ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں فرعونیت کا ثبوت دیا۔ ہر سرکاری افسر اپنے حلقے اور اپنے دائرۂ اختیار میں اپنے آپ کو صدرِ مملکت سے کسی طرح بھی کم نہیں سمجھتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کمزوروں اور زیر دستوں کے حقوق پامال کرتا تھا۔ اسے اگر کوئی فکر لاحق تھی تو صرف یہ کہ وہ حکمراں جماعت کی نظروں سے گرنے نہ پائے۔ عوام اور ان کی فلاح و بہبود سے اسے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ آمریت کی حفاظت میں اس نے دھونس اور دھاندلی کا خوب مظاہرہ کیا۔ عوام کے حقوق کو بڑی بے دردی کے ساتھ پامال کیا۔ رشوت کی صورت میں خوب مال لوٹا اور اس ناجائز کمائی سے مُسرفانہ اور عیش پرستانہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالی اور بڑی بے خوفی اور جسارت کے ساتھ بے بسوں اور مظلوموں کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنایا۔ اخبارات میں آئے دن اس کے جور و جفا کی جو وحشت ناک داستانیں منظرِ عام پر آتی رہی ہیں ان میں سے بعض تو ایسی لرزہ خیز اور بھیانک ہیں کہ اگر انہیں درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جائے تو وہ بھی ندامت کے مارے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور یہ کہہ کر اپنی برادت کا اظہار کریں کہ ہم گو درندے ہیں مگر سفاکی میں اس حد تک نہیں جا سکتے جس حد تک کہ خدا اور خلق سے بے خوف ہو کر انسان جاتا ہے۔ کھاریاں میں ایک کم عمر معصوم بچی کو عوام کی جان و مال کے محافظوں نے جس ہوسناکی کا نشانہ بنا کر موت کے

گھاٹ اُتارا وہ انسانیت کی ایک نہایت ہی دلفگار داستان ہے۔ اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے اسی قدر کم ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک واقعہ نہیں، اس سے پہلے کئی ایک واقعات اور اس کے بعد بھی چند دنوں میں اس قسم کے کئی ایک اور حادثات منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اور یہ تو وہ واقعات ہیں جن کا کسی طرح پتہ چل گیا ہے۔ یہاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رُوح فرسا واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر انہیں با اختیار نوکر شاہی بڑی آسانی کے ساتھ دبالیتی ہے اور عوام کے کانوں میں ان کی بھنک تک پڑنے نہیں پاتی۔ اس بیوروکریسی کی اس سے زیادہ سنگدلی اور بے رحمی کیا ہو سکتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر معصوم بچوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے اور پھر اپنی اس سفاکی کو چھپانے کے لیے اُن کے ماں باپ کو اُن کی لاشیں بھی نہ دی جائیں۔ وہ بے چارے اپنے ہاتھ سے ان کی تجہیز و تکفین کرنے اور نماز جنازہ ادا کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس قسم کا سنگدلانہ عمل وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو انسانی جذبات سے یکسر عاری ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے محاسبے سے اپنے آپ کو محفوظ خیال کریں۔

ایسے انسانیت کُش ماحول کے خلاف عوام کے اندر ردِ عمل پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے۔ لیکن ملک میں قیادت کا جو خلا پیدا ہو چکا ہے اور ایک قابلِ اعتماد متبادل قیادت کا جو فقدان رونما ہو چکا ہے اس کی وجہ سے یہ ردِ عمل مشکل ہی سے کوئی تعمیری رُخ اختیار کر سکتا ہے۔ لوگوں کے اندر آمریت کی جکڑ بندیوں کے خلاف شدید جوش اور ہیجان موجود ہے۔ وہ مستقبل کی تعمیر کسی نئے نقشے کے مطابق کرنے کے انتہائی آرزومند نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی آرزو کی متاعِ گم گشتہ کو ڈھونڈنے کے لیے بے حد فکر مند ہیں اور اس کے لیے سخت تگ و دو بھی کر رہے ہیں مگر نہ ان کی کوئی ایک جماعت ہے جس کی تنظیم سے وہ وابستہ ہوں اور نہ کوئی ایک معتمد علیہ رہنما ہے جس کے کہنے پر وہ چلیں اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف کامیابی کے ساتھ بڑھ سکیں۔

اگر اجتماعی سرگرمیوں پر اس قسم کی ناروا پابندیاں عائد نہ کی گئی ہوتیں تو آج ہماری سیاسی زندگی میں یہ مہیب خلا نظر نہ آتا، جس کی وجہ سے ہماری ساری قوم اس وقت ایک بن سری فوج بن کر رہ گئی ہے۔ کسی سیاسی جماعت کی تشکیل بچوں کا کھیل نہیں ہے جسے ریت کے گھروندے کی طرح آناً فاناً بنا بھی دیا جائے اور جب ذرا دل بھر جائے تو اسے گرا بھی دیا جائے۔

عوام کے اندر سیاسی شعور بیدار کرنا اور انہیں اپنی قوتوں کو منظم طریقے سے کسی تعمیری کام پر لگانے کی تربیت دینا بڑا صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے لیے طویل محنت اور لمبی ریاضت کی ضرورت ہے۔ یہ کام کبھی افراتفری کے عالم میں اچانک سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ باصلاحیت اور ایثار پیشہ افراد، جنہیں انسانیت سے سچی ہمدردی اور قومی معاملات کی سمجھ بوجھ ہو آگے بڑھیں اور قوم کے سامنے خیر اور بھلائی کا پروگرام پیش کریں۔ جن لوگوں کو ان کی دعوت میں کشش محسوس ہو اور جنہیں ان کے طریقِ کار سے اتفاق ہو اور وہ اس دعوت کے لیے قربانیاں دینے پر بھی آمادہ ہوں وہ ایک منظم صورت میں اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں۔ اس اجتماعی نظم کی پابندی اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے سے لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ اور انہیں حوصلہ مندی، جرأت اور تدبر کے ساتھ ملکی مسائل حل کرنے اور قومی معاملات کو سلجھانے کا سلیقہ آتا ہے۔

اس تربیت کے فقدان کے مضر اثرات آج پوری طرح ہمارے سامنے ہیں۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کا کسی سیاسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں اور جو سیاسی تنظیمیں ملک میں موجود ہیں ان میں سے صرف دو ایک کو چھوڑ کر نہ تو کوئی پروگرام رکھتی ہیں اور نہ ان کے وابستگان کا کوئی ملک گیر حلقہ ہے۔ ایک وقتی اور ہنگامی ضرورت کے تحت چند افراد مل کر اپنی ایک الگ سیاسی ٹولی بنا لیتے ہیں۔ پھر چونکہ انہیں کسی اجتماعی جدوجہد کا ڈھنگ نہیں آتا اس لیے وہ من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں قطعاً اس بات کا شعور اور احساس نہیں ہوتا کہ کسی جماعت سے وابستگی سے ان پر کیا فرائض اور کونسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی ڈسپلن کا پابند نہیں سمجھتے۔ جو بات ذہن میں آ جاتی ہے اسے سوچے سمجھے اور پارٹی پروگرام کی روشنی میں غور کیے بغیر اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک ایک جماعت کے اندر کئی کئی ٹولیاں جنم لیتی ہیں۔ پھر نہ صرف ہر ٹولی اپنا الگ راگ الاپتی ہے بلکہ اس کا ہر فرد بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے اس ملک میں کتنے لاتعداد سیاسی محاذ قائم ہو چکے ہیں اور مسلسل قائم ہو رہے ہیں۔ اور ان پر جو لوگ سینہ تان کر کھڑے ہیں ان کے اندر کس نوعیت کے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اگرچہ یہ سب لوگ ایک ہی قوت یعنی آمریت کے خلاف صف آرا ہیں مگر مناسب تربیت اور صحیح تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ابھی تک یہ سلیقہ نہیں آیا کہ وسیع تر مفاد کے حصول کی خاطر کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر منزلِ مقصود

کی طرف بڑھا جا سکتا ہے۔ اسلام سے محبت اور عقیدت کا دم بھرنے والوں میں وہ فکری ہم آہنگی نظر نہیں آتی جس کی جائز طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ بہت سے گروہ خالص اسلام کے علمبردار ہیں، مگر وہ متحد و متفق نہیں۔ اور ایک گروہ اسلام کا علمبردار بھی ہے اور اشتراکیت کا دم بھی بھرتا ہے۔ پھر بہت سے گروہ سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہے ہیں مگر ان میں بھی اشتراکیت کی کسی ایک تعبیر پر اتفاق نہیں ہے۔ ان کے اندر بھی کئی ایک گروہ اور طبقات موجود ہیں۔ ایک گروہ اس ملک میں اشتراکیت کا روسی ایڈیشن لانا چاہتا ہے اور دوسرا چینی، اور تیسرا کسی نرالی اشتراکیت کا وکیل ہے جس کا کوئی واضح نقشہ وہ پیش نہیں کرتا۔ پھر اشتراکیت لانے کے لیے بھی ہر گروہ مختلف راستوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ایک جبر و تشدد اور آمریت کے ذریعہ یہاں سُرخ انقلاب برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور دوسرا جمہوری طریق سے اشتراکیت کو یہاں کا غالب نظام بنانے کا آرزومند ہے۔ الغرض ہر فرد اور ہر گروہ اپنا ایک الگ نظریہ اور پروگرام رکھتا ہے اور سیاسی جماعتوں سے وابستگی کے باوجود اسے اس بات کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ اپنے سامنے کونسا پروگرام اور کونسا راستہ رکھتا ہے۔ اس خلفشار کی اصل وجہ محض آمریت کا وہ تسلط ہے جس نے صحت مند طریقے سے عوام کو سیاسی جماعتوں میں منظم ہونے اور آزادی سے کام کرنے کے مواقع سے محروم کر رکھا تھا۔ اس نے عوام کو عملاً یہ تربیت دی تھی کہ ملک اور اس کے معاملات سے بے فکر ہو کر بس اپنی تن پروری کی فکر میں لگے رہو۔ اور اگر مادی مفادات کا حصول چاہتے ہو تو حکمراں پارٹی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ۔ اور جب اس کی جگہ کسی دوسری پارٹی کی طرف عنانِ اقتدار منتقل ہوتی نظر آئے تو فوراً اپنا قبلہ بدل ڈالو۔

جب کسی ملک میں آمریت طویل عرصہ تک مسلط رہتی ہے تو عوام کے اندر یک جماعتی سٹیٹ کا رُجحان قدرتی طور پر پرورش پاتا ہے۔ لوگ عام طور پر برسرِ اقتدار جماعت سے وابستہ رہنے ہی میں عافیت اور مصلحت سمجھتے ہیں مگر اس وابستگی میں انہیں ایثار و قربانی کی تربیت نہیں ملتی بلکہ خود غرضی اور بے ضمیری کے ساتھ زندہ رہنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم اپنی آغوش میں باہمت اور مخلص افراد پالنے کی بجائے بے ضمیر اور طالع آزما افراد کی پرورش کرتی ہے جنہیں سوائے اپنے ذاتی مفاد کے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ حالات کے تیور دیکھ کر صبح و شام اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ اتنا بڑا زیاں ہے جن کا اندازہ نہیں

کیا جا سکتا۔ اگر اقتدار کو عوامی خواہشات کے مطابق تبدیل کرنے کا جمہوری راستہ کُھلا رہے اور سیاسی پارٹیوں کو اپنے آپ کو منظم کرنے اور عوام کے اندر اپنے خیالات پھیلانے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی آزادی حاصل ہو تو پھر بے ضمیر افراد اور سستی شہرت چاہنے والوں کو پنپنے کے بہت کم مواقع میسّر آتے ہیں۔ کسی جماعت سے افراد کی مخلصانہ وابستگی اور جماعتی مقاصد کے لیے ان کے ایثار و قربانی، اور ان کی سیرت و کردار سے اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور عوام کے لیے یہ جاننا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ ملک کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لیے مختلف جماعتوں میں سے کون سی جماعت زیادہ قابلِ اعتماد ہے اور کس گروہ کو وہ قول و عمل میں مخلص سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح جب مختلف جماعتیں قوم کے اندر عوامی پیمانے پر کام کریں تو لوگوں کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ کس کے تدبّر اور کارکردگی پر وہ بھروسا کر سکتے ہیں۔

صدرِ مملکت کے تازہ اعلان کے بعد اب ملک میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن میں اقتدار عوامی نمائندوں کی طرف پُرامن جمہوری طریقہ سے منتقل ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں جو لوگ تشدّد کے راستے ہی سے انقلاب لانے پر مُصر ہوں ان کو نیک نیت اور ملک کا خیر خواہ نہیں مانا جا سکتا۔ ان کی یہ روش خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس ملک کا آئندہ نظام ملک کے باشندوں کی آزاد مرضی سے طے کرانا نہیں چاہتے بلکہ مار دھاڑ کے ذریعہ سے اپنی مرضی پوری قوم پر زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے کسی طرح بھی صدر ایوب کی آمریت سے مختلف قرار نہیں دیا جا سکتا، اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پاکستان کے لوگ ایک آمریت کی جگہ دوسری آمریت کے قیام کو برداشت کریں۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ عوام کے ذہنوں میں یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ جو لوگ جبر اور تشدّد کے ذریعہ اُن پر مسلط ہونے کے مذموم ارادے رکھتے ہیں وہ عوامی خواہشات کا کبھی احترام نہیں کر سکتے۔ جبر و تشدّد جمہوریت کا نہیں آمریت کا مؤثر ہتھیار ہے اور اس سے ہمیشہ رائے عامہ کو کچلنے اور عوام پر چند لوگوں کی مرضی ٹھونسنے کا کام ہی لیا جاتا رہا ہے۔ آمریت کے جلو میں ہمیشہ وہ نظام آیا کرتا ہے جسے عوام اگر ابتداءً دھوکا کھا کر قبول کر بھی لیں تو آخر کار اُس کے بُرے نتائج دیکھ کر اُس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ کوئی نظام جو عوامی خواہشات اور آرزوؤں کا مظہر اور ترجمان ہو اسے تشدّد اور مار دھاڑ سے مسلط کرنے کی نہ کوشش کی جاتی ہے اور

نہ ایسی کوشش کی کبھی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔ عوام کی عظیم اکثریت ترغیب ہی سے اس کی افادیت کی قائل ہوتی ہے اور اس کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیتی ہے۔ تشدد کے ذریعہ سے آنے والا انقلاب پہلے تار دھاڑ سے مسلط ہوتا ہے اور پھر ملک پر قابض ہونے کے بعد پولیس اور فوج کے ذریعہ سے عوام کو دبا کر رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حیاتِ انسانی میں سختی کا بھی ایک مقام ہے۔ بعض اوقات فی الحقیقت ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ سختی سے کام لیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا لیکن انسانی زندگی کے طویل تجربات کی روشنی میں اس حقیقت کو کوئی عقل کا اندھا ہی جھٹلا سکتا ہے کہ افکار و نظریات کے اندر تبدیلی لائے بغیر کسی صحت مند، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ معاشرتی، سیاسی اور معاشی تغیرات درحقیقت انسان کے قلب و دماغ کی تبدیلی کے عکس ہیں اور قلب و دماغ کی اقلیم ایک ایسی کشور ہے جو تشدد کے تسلط سے ہمیشہ آزاد ہوتی ہے بلکہ تشدد کا ہر حربہ اس کے اندر نفرت و حقارت کا زبردست ہیجان پیدا کرتا ہے۔ تاریخِ انسانی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ آج تک دنیا میں جتنے بھی پائیدار اور ہمہ گیر انقلابات آئے وہ سارے انسان کے فکر و نظر کے زاویوں میں تبدیلی کا نتیجہ تھے اور ان کے مقابلے میں جو اکھاڑ پچھاڑ وقتی جوش اور ہنگاموں کی وجہ سے عمل میں آئی اس کے اثرات نقش بر آب ثابت ہوئے اور تباہی و بربادی کے روح فرسا اور بھیانک مناظر کے سوا اس کی کوئی یادباقی نہ رہی۔ قتل و غارت کے ذریعہ سے عوام کی گردنوں کو جھکایا جا سکتا ہے مگر دلوں کو نہیں جھکایا جا سکتا۔ بلکہ گردن تشدد اور دباؤ سے جس قدر جھکنے پر مجبور کی جاتی ہے اُسی نسبت سے دل بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ جلد ہی اسے نفرت و حقارت کے اظہار کا کوئی موقع میسر آئے۔

دُور نہ جائیے صرف اپنے ملک میں اکتوبر کے انقلاب کو دیکھیے کہ یہ اپنی مضبوط گرفت اور غیر معمولی قوت و طاقت کے باوجود کس قدر ناکام ثابت ہُوا ہے۔ ایک شخص جسے عوام نے ملک کے دفاع کا کام سپرد کر رکھا تھا دفعتہً اٹھا اور عوام کے سارے حقوق پامال کرتے ہوئے فوج کے بل بوتے پر تختِ اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے اپنے دل پسند افکار و نظریات کو قومی دولت کے صرف سے پھیلانا شروع کیا اور جن جن تدابیر کو اپنی عقل کے مطابق

مناسب اور موزوں سمجھا انہیں جبر کے ساتھ عمل میں لایا۔ پھر اپنی شخصیت کو عوام کی نظر میں محبوب و مقبول بنانے کے لیے ہر طرح کے جتن کیے اور ہر دوسری آواز کو بلند ہونے سے روک دیا۔ مگر کسی معاملے میں بھی اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ لوگوں نے نہ تو اس کے پروگراموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور نہ اس کی ذات کے ساتھ محبت و عقیدت کے گہرے جذبات وابستہ کیے۔ عوام کے اندر اس شخص کے افکار کی کیا حیثیت ہے اور ان کے دلوں میں اُس کا فی الحقیقت کس قدر احترام ہے اس کا اندازہ کچھ تو اسے ہو گیا ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو گا جب وہ اقتدار کے اس بلند مقام سے اُتر کر عوام کی سطح پر آ کر کھڑا ہو گا۔

ہمارے ملک کے ہر سوچنے سمجھنے والے فرد کو اس تجربہ کی ناکامی اور اس کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس نوعیت کے تجربات کا آخر ہر جگہ یہی حشر کیوں ہوتا ہے۔ ہمارے اس دور میں خود مسلمان ملکوں کے اندر یہ تجربہ مصر، شام، عراق، انڈونیشیا، ترکی اور بہت سے دوسرے ممالک میں ہوا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بھی ہنگری، پولینڈ، مشرقی جرمنی، چیکوسلوواکیا اور برما میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ سب جگہ اس کے نہایت عبرتناک نتائج سامنے آئے ہیں۔ جبر اور تشدد نے حکومت کے ایوان تو متزلزل کیے۔ حکومت کرنے والے ہاتھوں میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ مگر کسی ایک جگہ بھی یہ تشدد حکمران جماعت کے افکار کو عوام کے دل و دماغ میں نہ اتار سکا۔ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جب بھی کوئی خارجی چیز یلغار کر کے اس کی طرف بڑھتی ہے تو وہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے اپنے آپ کو اس کی مدافعت کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ اس یلغار کی لپیٹ میں آ کر ہمت ہار بیٹھے لیکن اس کا دماغ کبھی اسے دل و جان سے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اسے شدید مجبوری سمجھ کر وقتی طور پر گوارا کرتا ہے۔ یہی حال افکار و نظریات کا ہے۔ جن تصورات کو اندھے بہرے جوش کے ساتھ بدست اقتدار کی پُشت پر سوار کر کے حملہ کرنے پر اُبھارا جاتا ہے وہ ایک مرتبہ پوری فضا میں شدید ہلچل پیدا کر دیتے ہیں اور سطح بین لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے جسم و روح دونوں پر ان کا مستقل تسلط قائم ہو گیا ہے۔ مگر جلد ہی اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے والوں پر یہ تلخ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ تسلط جسے وہ لافانی سمجھتے تھے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

اس نوعیت کے سطحی اور غیر فطری انقلابات کے عبرتناک نتائج سے ہماری آنکھیں اب پوری طرح کھل جانی چاہییں اور ہمارے اندر اگر واقعی ملک وملت کی محبت موجود ہے اور ہم اخلاص کے ساتھ اس کی خیر خواہی چاہتے ہیں تو ہمیں پوری دیانتداری کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ ہم قوم کو آگ کے اس کھیل سے ہمیشہ محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے اور کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہ کریں گے جس سے اجتماعی امور کے فیصلے رائے کے بجائے بندوق کی گولی سے کیے جائیں۔ یہ راہ بڑی تباہ کن ہے۔ جب کوئی قوم ایک مرتبہ اس پر چل پڑتی ہے تو پھر سوائے بربادی کے اور کوئی چیز اس کے حصے میں نہیں آتی۔ اس گولی نے لاتعداد قوموں کو تباہ کیا ہے۔ خدارا اسے اس ارضِ پاک میں انسانی خون کی چاٹ نہ ڈالیے، کیونکہ اگر اسے ایک مرتبہ اس کی چاٹ لگ گئی تو پھر کسی فرد کا خون اس کی ہوس سے محفوظ نہ ہوگا۔

اگر اصول اور انصاف کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس ملک میں کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظریۂ حیات کے نفاذ پر اصرار کرے۔ یہ ملک جن لاتعداد معصوم جانوں کے خون سے بنا ہے ان سب نے اسلام اور صرف اسلام کی خاطر یہ قربانیاں دی تھیں۔ ان کی پاکیزہ روحیں یہ خبر سننے کے لیے گوش برآواز ہیں کہ جس مقدس مقصد کے لیے انہوں نے جان ومال اور عزت وآبرو لٹائی وہ پورا ہو گیا ہے۔ خدارا ان مقدس روحوں کو تڑپا کر خدا کے عذاب کو دعوت نہ دیجیے کیونکہ مظلوم کی پکار اور اس کی دستگیری کرنے والی بلند وبالا ذات کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں ہوتی۔

اگر بالفرض تمہارے دل ان پاک طینت مظلوموں کی مظلومیت کے احساس سے خالی ہو چکے ہیں اور تم یہ بات یکسر بھول چکے ہو کہ یہ قوم خدا سے کس وعدے کے ساتھ اس ملک کی طلبگار ہوئی تھی تو اس حال میں بھی کم از کم اس کے باشندوں پر اتنا رحم تو ضرور کرو کہ انہیں جبر وتشدد کی تعلیم دے کر آگ کے سمندر کی طرف نہ دھکیلو۔ اگر تمہیں اسلام کے سوا کچھ دوسرے نظریات عزیز ہیں تو انہیں لوگوں کے سامنے کھل کر پیش کرو۔ دلائل سے ان کی برتری ثابت کرو اور اگر عوام کی اکثریت تمہارے ساتھ متفق ہو کر تمہیں عنانِ اقتدار دینے پر آمادہ ہو جائے

تو پھر یہ ذمہ داری سنبھالو۔ اس ایک معقول اور سیدھے راستہ کے علاوہ ہر دوسرا راستہ بربادی کا راستہ ہے صرف اسی رستے میں تمہاری اور پوری قوم کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ خدا کرے کہ جوش و خروش کی اس فضا میں تشدد کے المناک نتائج ہماری قوم کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔

ہماری زندگی کا اخلاقی اور دینی معیار کس قدر پست ہو چکا ہے اور مال و دولت کی اندھی محبت نے ہمیں شرافت کے لطیف احساسات سے کس قدر بیگانہ بنا دیا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ پاک و ہند کے معروف دینی اور ادبی جریدے "معارف" کے مندرجہ ذیل نوٹ سے لگایا جا سکتا ہے:

"گذشتہ مہینہ لکھا جا چکا ہے کہ پاکستان کے ناشرین نے دار المصنفین کی کتابیں چھاپ لی ہیں۔ اب یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض ناشر سیرۃ النبی کا پورا سٹ چھاپنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ پاکستان کی بدولت یوں ہی ہندوستان کے اسلامی ادارے نیم جان ہو رہے ہیں۔ اب اس کے خود غرض ناشران کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر دار المصنفین کی کتابیں اس طرح پاکستان میں چھپتی رہیں تو اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر حکومت پاکستان تک ہماری آواز پہنچ سکتی ہے تو ہماری درخواست ہے کہ وہ ان ناشروں کو اس خود غرضی سے روکنے کی کوشش کرے عرصہ ہوا ایک ناشر نے سیرۃ النبیؐ کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا۔ اُس زمانہ میں سردار عبد الرب نشتر زندہ تھے، انہوں نے اس تاجر کو روکا اور پاکستانی پریس نے اس کے خلاف اتنا لکھا کہ وہ مطبوعہ کتابیں دار المصنفین کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔"

اس ملک میں اگر اخلاقی حس کا بالکل ہی جنازہ نہیں نکل چکا تو ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ہر وہ فرد یا ادارہ جو اس ظلم اور زیادتی کو روکنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے وہ ضرور اس کی کوشش کریگا، اور جو لوگ اس قسم کی دھاندلیاں کر رہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان سے اس قدر سختی سے باز پرس کریگا کہ آئندہ کبھی انہیں اس شرمناک کاروبار کی جسارت نہ ہو گی ہم حکومت سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں پوری دلچسپی لے گی اور بھارت کے ایک قدیم علمی و دینی ادارے کو اس ظلم و ستم سے بچانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے گی۔

تفہیم القرآن

المنافقون

نام پہلی آیت کے فقرہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اس سُورۃ کا نام بھی ہے اور اس کے مضمون کا عنوان بھی، کیونکہ اس میں منافقین ہی کے طرزِ عمل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، یہ سُورۃ غزوۂ بنی المُصْطَلِق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر یا تو دورانِ سفر میں نازل ہوئی ہے، یا حضورؐ کے مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد فوراً ہی اس کا نزول ہوا ہے۔ اور ہم سورۂ نور کے دیباچے میں یہ بات بتحقیق بیان کر چکے ہیں کہ غزوۂ بنی المصطلق شعبان سنہ ۶ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس طرح اِس کی تاریخِ نزول ٹھیک ٹھیک متعین ہو جاتی ہے۔

تاریخی پس منظر جس خاص واقعہ کے بارے میں یہ سُورۃ نازل ہوئی ہے اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مدینے کے منافقین کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لی جائے، کیونکہ جو واقعہ اس موقع پر پیش آیا تھا وہ محض ایک اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک پورا سلسلۂ واقعات تھا جو بالآخر اس نوبت تک پہنچا۔

مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے اَوس اور خزرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر ایک شخص کی قیادت و سیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کر دیں حتیٰ کہ اس کے لیے تاج بنا بھی لیا گیا تھا۔ یہ قبیلۂ خزرج کا رئیس عبداللہ بن اُبَی بن سَلُول تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلۂ خزرج میں اس کی بزرگی بالکل متفق علیہ تھی، اور اَوس و خزرج اس سے پہلے کبھی ایک

شخص کی قیادت پر جمع نہیں ہوئے تھے (ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۳۴)

اس صورتِ حال میں اسلام کا چرچا مدینے پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے بااثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ ہجرت سے پہلے بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینۂ طیبہ تشریف لانے کی دعوت دی جا رہی تھی اُس وقت حضرت عباس بن عُبادہ بن نَضلہؓ انصاری اس دعوت کو صرف اس مصلحت سے مؤخر کرنا چاہتے تھے کہ عبداللہ بن اُبی بھی بیعت اور دعوت میں شریک ہو جائے، تاکہ مدینہ بالاتفاق اسلام کا مرکز بن سکے۔ لیکن جو وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا اس نے اس مصلحت کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے تمام شرکاء جن میں دونوں قبیلوں کے ۷۵ آدمی شامل تھے، ہر خطرہ مول لے کر حضورؐ کو دعوت دینے کے لیے تیار ہو گئے (ابن ہشام، ج ۲، ص ۸۹)۔ اس واقعہ کی تفصیلات ہم سورۂ انفال کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد جب حضورؐ مدینے پہنچے تو انصار کے ہر گھرانے میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبی بے بس ہو گیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اُن بہت سے حامیوں کے ساتھ، جن میں دونوں قبیلوں کے شیوخ اور سردار شامل تھے، داخلِ اسلام ہو گیا، حالانکہ دل ان سب کے جل رہے تھے، اور خاص طور پر ابنِ اُبی کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔ ایک طرف حال یہ تھا کہ ہر جمعہ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے بیٹھتے تو عبداللہ بن اُبی اٹھ کر کہتا کہ "حضرات، یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں جن کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت اور شرف بخشا ہے، لہٰذا آپ ان کی تائید کریں اور جو کچھ یہ فرماتے ہیں اسے غور سے سنیں اور ان کی اطاعت کریں" (ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۱۱)۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا اور مخلص مسلمانوں پر یہ بات کھلتی چلی جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور گروہِ اہلِ ایمان سے سخت بغض رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضورؐ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابن اُبّی نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپ نے حضرت سعد بن عُبادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ، اس شخص کے ساتھ نرمی برتیئے آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لیے تاجِ شاہی تیار کر رہے تھے، اب یہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے" (ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۳۷-۲۳۸)۔

جنگِ بدر کے بعد جب یہودِ بنی قینقاع کی صریح بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر چڑھائی کی تو یہ شخص اُن کی حمایت پر اُٹھ کھڑا ہوا اور حضورؐ کی زرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ "یہ سات سو مردانِ جنگی، جو ہر دشمن کے مقابلے میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آج ایک دن میں آپ انہیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم، مَیں آپ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرے ان حلیفوں کو معاف نہ کر دینگے" (ابن ہشام، ج ۳، ص ۵۱-۵۲)۔

جنگِ اُحُد کے موقع پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے اُلٹا واپس آگیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔ اِن ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضورؐ کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اِس واقعہ کے بعد مدینے کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے، اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لیے گئے جو منافقت میں اس کے شریکِ کار تھے۔ اسی بنا پر جنگِ اُحد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور یہ شخص حضورؐ کے خطبہ سے پہلے حسبِ معمول تقریر کرنے کے لیے اُٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر کہا "بیٹھ جاؤ، تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو"۔ مدینے میں یہ پہلا موقع تھا کہ علانیہ اس شخص کی تذلیل کی گئی۔ اس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں پر سے کودتا پھاندتا مسجد سے نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصاریوں نے اس سے کہا "یہ کیا حرکت کر رہے

ہو، واپس چلو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغفار کی درخواست کرو۔" اس نے بگڑ کر جواب دیا، "میں ان سے کوئی استغفار نہیں کرانا چاہتا" (ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۱۱)۔

پھر ۴ھ میں غزوۂ بنی النضیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ ان یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے، اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے خود کھول دیا، جیسا کہ سورۂ حشر کے دوسرے رکوع میں گزر چکا ہے۔

لیکن اس کی اور اُس کے ساتھیوں کی اتنی پردہ دری ہو جانے کے باوجود جس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے، ــــ وہ یہ تھی کہ منافقین کا ایک بڑا جتھا اس کے ساتھ تھا۔ اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے بہت سے سردار اس کے حامی تھے۔ مدینے کی آبادی میں کم از کم ایک تہائی تعداد اُس کے ساتھیوں کی موجود تھی، جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ظاہر ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے ان دشمنوں سے بھی جنگ مول لے لی جاتی۔ اسی بنا پر ان کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی حضورؐ ایک مدت تک ان کے ساتھ ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے، نہ ہمت کہ علانیہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ جاتے، یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ کھلم کھلا مل کر میدان میں آ جاتے۔ بظاہر وہ اپنا ایک مضبوط جتھا بنائے ہوئے تھے مگر ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر کی آیات ۱۲-۱۴ میں صاف صاف کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان بنے رہنے ہی میں اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں آتے تھے۔ نمازیں پڑھتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے ڈالتے تھے۔ زبان سے ایمان کے وہ لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کے لیے

ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں جن سے وہ خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو اُن نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی برادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں ان کو پہنچ سکتے تھے، اور فتنہ پردازی کے اُن مواقع سے بھی فائدہ اٹھا رہے تھے جو اس برادری میں شامل رہ کر انہیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافقین کو غزوۂ بنی المُصْطَلِق کی مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا، اور انہوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اٹھا دیئے جو مسلمانوں کی جمعیت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے۔ مگر قرآن پاک کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اہل ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی اس کی بدولت ان دونوں فتنوں کا بروقت قلع قمع ہو گیا اور یہ منافقین اُلٹے خود ہی رُسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے۔ اور دوسرا فتنہ یہ ہے جس کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کو بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی، طبرانی، ابن مَرْدُوْیَہ، عبدالرزاق، ابن جریر طبری، ابن سعد اور محمد بن اسحاق نے بکثرت سندوں سے نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں اس مہم کا نام نہیں لیا گیا ہے جس میں یہ پیش آیا تھا، اور بعض میں اسے غزوۂ تبوک کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر مَغازی اور سِیَر کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ غزوۂ بنی المُصْطَلِق کے موقع پر پیش آیا تھا۔ صورتِ واقعہ تمام روایات کو جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے:

بنی المصطلق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکرِ اسلام اُس بستی میں ٹھیرا ہوا تھا جو مُرَیْسِیع نامی کنوئیں پر آباد تھی کہ یکایک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا نام جَہْجاہ بن مسعود غِفاری تھا جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور اُن کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اور دوسرے صاحب سِنان بن وَبَر الجُہَنی[1] تھے جن کا قبیلہ خزرج کے ایک قبیلے کا حلیف تھا۔ زبانی ترش کلامی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی اور جَہجاہ نے سِنان کے ایک لات رسید کر دی جسے اپنی قدیم

[1] دونوں اصحاب کے نام مختلف روایات میں مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے یہ نام ابن ہشام کی روایت سے لیے ہیں۔

مبنی روایات کی بنا پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے۔ اس پر سنان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا، اور جہجاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابن اُبی نے اِس جھگڑے کی خبر سنتے ہی اَوس اور خزرج کے لوگوں کو بھڑکانا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ اُدھر سے کچھ مہاجرین بھی نکل آئے۔ قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی اور اُسی جگہ انصار و مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے اور اُسے شکست دے کر ابھی اُسی کے علاقے میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ شور سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل آئے اور آپ نے فرمایا مابالُ دعوی الجاھلیۃ؟ مالکم ولدعوۃ الجاھلیۃ؟ دعُوھا فانھا منتنۃ۔ "یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں اور یہ جاہلیت کی پکار کہاں؟ اِسے چھوڑ دو، یہ بڑی گندی چیز ہے[1]"۔ اس پر دونوں طرف کے صالح لوگوں نے آگے بڑھ کر

---

[1] یہ ایک بڑی اہم بات ہے جو اس موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمائی۔ اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے کے لیے اِسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ دو آدمی اگر اپنے جھگڑے میں لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہیں تو وہ کہیں مسلمانو، آؤ اور ہماری مدد کرو، یا یہ کہ لوگو ہماری مدد کے لیے آؤ۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے قبیلے، یا برادری، یا نسل و رنگ، یا علاقے کے نام پر لوگوں کو پکارتا ہے تو یہ جاہلیت کی پکار ہے، اور اس پکار پر لبیک کہہ کر آنے والے اگر یہ نہیں دیکھتے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون، اور حق و انصاف کی بنا پر مظلوم کی حمایت کرنے کے بجائے اپنے اپنے گروہ کے آدمی کی حمایت میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں تو یہ جاہلیت کا فعل ہے جس سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گندی اور گھناؤنی چیز قرار دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ تمہارا اس جاہلیت کی پکار سے کیا واسطہ، تم اسلام کی بنیاد پر ایک ملت بنے تھے، اب یہ انصار اور مہاجر کے نام پر تمہیں کیسے پکارا جا رہا ہے، اور اس پکار پر تم کہاں دوڑے جا رہے ہو؟ علامہ سُہیلی نے رَوض الانف میں لکھا ہے کہ فقہائے اسلام نے کسی جھگڑے یا اختلاف میں جاہلیت کی پکار بلند کرنے کو ایک فوجداری جرم قرار دیا ہے۔ ایک گروہ اس کی سزا پچاس ضرب تازیانہ قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ دس ضرب تجویز کرتا ہے، اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کی سزا حالات کی مناسبت سے دی جانی چاہیے، بعض حالات میں صرف زجر و توبیخ کافی ہے، بعض دوسرے حالات میں ایسی پکار بلند کرنے والے کو قید کرنا چاہیے، اور اگر یہ زیادہ شر انگیز ہو تو اس کے مرتکب کو سزائے تازیانہ دینی چاہیے۔

معاملہ رفع دفع کرا دیا اور سنان نے جہجاہ کو معاف کر کے صلح کر لی

اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں نفاق تھا عبداللہ بن اُبَی کے پاس پہنچا اور ان لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ "اب تک تو تم سے امیدیں وابستہ تھیں اور تم مدافعت کر رہے تھے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلے میں ان کنگلوں[۱] کے مددگار بن گئے ہو۔" ابن اُبَی پہلے ہی کھول رہا تھا۔ ان باتوں سے وہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا "یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، ان پر اپنے مال تقسیم کیے، یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر ہمارے حریف بن گئے۔ ہماری اور ان قریش کے کنگلوں (یا اصحاب محمدؐ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کر تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم، مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا"

مجلس میں اتفاق سے حضرت زید بن اَرقم بھی موجود تھے جو اُس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے انہوں نے یہ باتیں سن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا، اور ان کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضورؐ نے زید کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے جو کچھ سنا تھا من وعن دُہرا دیا۔[۲] حضورؐ نے فرمایا شاید تم ابن اُبی سے ناراض ہو، ممکن ہے تم کو سننے میں کچھ غلطی ہو گئی ہو، ممکن ہے تمہیں شبہ ہو گیا ہو کہ ابن اُبَی یہ کہہ رہا ہے۔ مگر زید نے عرض کیا نہیں حضور، خدا کی قسم میں نے اس کو یہ باتیں کہتے سُنا ہے۔ اس پر حضورؐ نے ابن اُبی کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مُکر گیا

---

۱ مدینہ کے منافقین اُن تمام لوگوں کو جو اسلام قبول کر کے مدینہ میں آ رہے تھے، "جلابیب" کہا کرتے تھے۔ لغوی معنی تو اس لفظ کے گلیم پوش یا موٹے جھوٹے کپڑے پہننے والے کے ہیں، مگر اصل مفہوم جس میں وہ لوگ غریب مہاجرین کی تذلیل کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے تھے، کنگلے کے لفظ سے زیادہ صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔

۲ فقہاء نے اس سے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ ایک شخص کی بُری بات دوسرے شخص تک پہنچانا اگر کسی دینی، اخلاقی یا ملّی مصلحت کے لیے ہو تو یہ چغلی کی تعریف میں نہیں آتا۔ شریعت میں جس چغلی خوری کو حرام کیا گیا ہے وہ فساد کی غرض سے اور لوگوں کو آپس میں لڑانے کے لیے چغلی کھانا ہے۔

اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضورؐ، لڑکے کی بات ہے۔ شاید اسے وہم ہو گیا ہو۔ یہ ہمارا شیخ اور بزرگ ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک لڑکے کی بات کا اعتبار نہ فرمایئے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زیدؓ کو بھی ملامت کی اور وہ بے چارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضورؐ زیدؓ کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن اُبی کو بھی، اس لیے آپ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے آ کر عرض کیا "مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اُڑا دوں۔ یا اگر مجھے یہ اجازت دینا مناسب خیال نہیں فرماتے تو انصار میں سے مُعاذ بن جبل، یا عبّاد بن بِشر، یا سعد بن مُعاذ، یا محمد بن مَسلَمہ کو حکم دیجیے[1] کہ وہ اسے قتل کر دیں"۔ مگر حضورؐ نے فرمایا "ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں ہی کو قتل کر رہا ہے"۔ اس کے بعد آپ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا، حالانکہ حضورؐ کے معمول کے لحاظ سے وہ کوچ کا وقت نہ تھا۔ مسلسل ۳۰ گھنٹے چلتے رہے یہاں تک کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے۔ پھر آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تھکے ہوئے لوگ زمین پر کمر لگاتے ہی سو گئے۔ یہ آپ نے اس لیے کیا کہ جو کچھ مُرَیسیع کے کنوئیں پر پیش آیا تھا اس کے اثرات لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائیں۔ راستے میں انصار کے ایک سردار حضرت اُسَید بن حُضَیر آپ سے ملے اور عرض کیا "یا رسول اللہ آج آپ نے ایسے وقت کوچ کا حکم دیا جو سفر کے لیے موزوں نہ تھا اور آپ کبھی ایسے وقت میں سفر کا آغاز نہیں فرمایا کرتے تھے؟" حضورؐ نے جواب دیا "تم نے سنا نہیں کہ تمہارے ان صاحب نے کیا گوہر افشانی کی ہے؟"۔ انہوں نے پوچھا کون صاحب؟ فرمایا عبداللہ بن اُبی۔ انہوں نے پوچھا اس نے کیا کہا؟ فرمایا "اس نے کہا ہے کہ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال باہر کرے گا"۔ انہوں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ، خدا کی قسم، عزت والے تو آپ ہیں اور ذلیل وہ ہے، آپ جب چاہیں اسے نکال سکتے ہیں"۔

---

[1] مختلف روایات میں مختلف انصاری بزرگوں کے نام آئے ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا کہ آپ ان میں سے کسی شخص سے یہ خدمت لے لیں۔ اگر مجھ سے اس لیے یہ کام لینا مناسب خیال نہیں فرماتے کہ میں مہاجر ہوں، میرے ہاتھوں اس کے مارے جانے سے فتنے بھڑک اٹھنے کا امکان ہے۔

رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابن اُبی کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابن اُبی سے کہا جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے معافی مانگو۔ مگر اس نے تڑخ کر جواب دیا "تم نے کہا کہ اُن پر ایمان لاؤ۔ میں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دے دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمدؐ کو سجدہ کروں"۔ ان باتوں سے اس کے خلاف مومنینِ انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اُس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینۂ طیبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن اُبی کے صاحبزادے، جن کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، تلوار سونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے "آپ نے کہا تھا کہ مدینہ واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا، اب آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسولؐ کی۔ خدا کی قسم، آپ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آپ کو اجازت نہ دیں"۔ اس پر ابن اُبی چیخ اٹھا "خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے"۔ لوگوں نے یہ خبر حضورؐ تک پہنچائی اور آپ نے فرمایا "عبداللہ سے کہو، اپنے باپ کو گھر آنے دے"۔ عبداللہؓ نے کہا "اُن کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں"۔ اُس وقت حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا "کیوں عمر، اب تمہارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے اُس کو قتل کرنے کی اجازت دیجیے اُس وقت اگر تم اسے قتل کر دیتے تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑک اٹھتیں۔ آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل تک کیا جا سکتا ہے"۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا "خدا کی قسم اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی بات میری بات سے زیادہ مبنی بر حکمت تھی"۔[1]

---

[1] اس سے دو اہم شرعی مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ جو طرزِ عمل ابن اُبی نے اختیار کیا تھا، اگر کوئی شخص مسلم ملّت میں رہتے ہوئے اُس طرح کا رویّہ اختیار کرے تو وہ قتل کا مستحق ہے۔ دوسرے یہ کہ محض قانوناً کسی شخص کے مستحقِ قتل ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرور اسے قتل ہی کر دیا جائے۔ ایسے کسی فیصلے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس کا قتل کسی عظیم تر فتنے کا موجب تو نہ بن جائے گا۔ حالات سے آنکھیں بند کر کے قانون کا اندھا دھند استعمال بعض اوقات اُس مقصد کے خلاف بالکل الٹا نتیجہ پیدا کر دیتا ہے جس کے لیے قانون استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک منافق اور مفسد آدمی کے پیچھے کوئی قابلِ لحاظ سیاسی طاقت موجود ہو تو اسے سزا دے کر مزید فتنوں کو سر اٹھانے کا موقع دینے سے بہتر یہ ہے کہ حکمت اور تدبّر کے ساتھ اُس اصل

یہ تھے وہ حالات جن میں یہ سورت، اغلب یہ ہے کہ حضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔

ہ۔ سیاسی طاقت کا استیصال کر دیا جائے جس کے بل پر وہ شرارت کر رہا ہو۔ یہی مصلحت تھی جس کی بنا پر حضورؐ نے عبداللہ بن اُبَیّ کو اُس وقت بھی سزا نہ دی جب آپ اسے سزا دینے پر قادر تھے، بلکہ اُس کے ساتھ برابر نرمی کا سلوک کرتے رہے، یہاں تک کہ دو تین سال کے اندر مدینہ میں منافقین کا زور ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اَے نبیؐ، جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسُول ہیں"۔ ہاں، اللہ جانتا ہے کہ تم ضرور اُس کے رسول ہو، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے[1]

---

[1] یعنی جو بات وہ زبان سے کہہ رہے ہیں وہ ہے تو بجائے خود سچی، لیکن چونکہ اُن کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جسے وہ زبان سے ظاہر کر رہے ہیں، اس لیے اپنے اِس قول میں وہ جھوٹے ہیں کہ وہ آپ کے رسول ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شہادت دو چیزوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک وہ اصل بات جس کی شہادت دی جائے۔ دوسرے اُس بات کے متعلق شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ۔ اب اگر بات بجائے خود بھی سچی ہو اور شہادت دینے والے کا عقیدہ بھی وہی ہو جس کو وہ زبان سے بیان کر رہا ہو، تو ہر لحاظ سے سچا ہوگا۔ اور اگر بات اپنی جگہ جھوٹی ہو، لیکن شہادت دینے والا اُسی کے حق ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو، تو ہم ایک لحاظ سے اُس کو سچا کہیں گے، کیونکہ وہ اپنا عقیدہ بیان کرنے میں صادق ہے، اور ایک دوسرے لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے، کیونکہ جس بات کی وہ شہادت دے رہا ہے وہ بجائے خود غلط ہے۔ اس کے برعکس اگر بات اپنی جگہ سچی ہو لیکن شہادت دینے والے کا اپنا عقیدہ اس کے خلاف ہو، تو ہم اِس لحاظ سے اس کو سچا کہیں گے کہ وہ صحیح بات کی شہادت دے رہا ہے، اور اِس لحاظ سے اس کو جھوٹا کہیں گے کہ اس کا اپنا عقیدہ وہ نہیں ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مومن اگر اسلام کو برحق کہے تو وہ ہر لحاظ سے سچا ہے لیکن ایک یہودی اپنی یہودیت پر قائم رہتے ہوئے اس دین کو اگر برحق کہے تو بات اس کی سچی ہوگی مگر شہادت اس کی جھوٹی قرار دی جائے گی، کیونکہ وہ اپنے عقیدے

ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے[۲] اور اِس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے اور دنیا کو روکتے ہیں[۳]۔ کیسی بُری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے ایمان لا کر

کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ اور اگر وہ اِس دین کو باطل کہے، تو ہم کہیں گے کہ بات اصلی جھوٹی ہے، مگر شہادت وہ اپنے عقیدے کے مطابق سچی دے رہا ہے۔

[۲] یعنی اپنے مسلمان اور مومن ہونے کا یقین دلانے کے لیے جو قسمیں وہ کھاتے ہیں، اُن سے وہ ڈھال کا کام لیتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے غصے سے بچے رہیں اور ان کے ساتھ مسلمان وہ برتاؤ نہ کر سکیں جو کھلے کھلے دشمنوں سے کیا جاتا ہے۔

اِن قسموں سے مراد وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو وہ بالعموم اپنے ایمان کا یقین دلانے کے لیے کھایا کرتے تھے، اور وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو کسی منافقانہ حرکت کے پکڑے جانے پر وہ کھاتے تھے تاکہ مسلمانوں کو یہ یقین دلائیں کہ وہ حرکت انہوں نے منافقت کی بنا پر نہیں کی تھی، اور وہ قسمیں بھی ہو سکتی ہیں جو عبداللہ بن اُبَی نے حضرت زید بن اَرقم کی دی ہوئی خبر کو جھٹلانے کے لیے کھائی تھیں۔ اِن سب احتمالات کے ساتھ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس قول کو قسم قرار دیا ہو کہ "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں"۔ اس آخری احتمال کی بنا پر فقہاء کے درمیان یہ بحث پیدا ہوئی ہے کہ کوئی شخص "میں شہادت دیتا ہوں" کے الفاظ کہہ کر کوئی بات بیان کرے تو آیا اسے قسم یا حلف (OATH) قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب (امام زُفَر کے سوا) اور امام سفیانؒ ثوری اور امام اَوزاعی اسے حلف (شرعی اصطلاح میں یمین) قرار دیتے ہیں۔ امام زُفر کہتے ہیں کہ یہ حلف نہیں ہے۔ امام مالک سے دو قول مروی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مطلقاً حلف ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اگر اس نے "شہادت دیتا ہوں" کے الفاظ کہتے وقت نیت یہ کی ہو کہ "خدا کی قسم میں شہادت دیتا ہوں"، یا "خدا کو گواہ کر کے میں شہادت دیتا ہوں"، تو اس صورت میں یہ حلفیہ بیان ہوگا ورنہ نہیں۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اگر کہنے والا یہ الفاظ بھی کہے کہ میں خدا کو گواہ کر کے شہادت دیتا ہوں" تب بھی اس کا یہ بیان حلفیہ بیان نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ یہ الفاظ اس نے حلف اٹھانے کی نیت سے کہے ہوں (احکام القرآن للجصاص۔ احکام القرآن لابن العربی)۔

[۳] صدّ کا لفظ عربی زبان میں لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اس لیے صَدُّوا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ اس راستے سے دوسروں کو روکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ترجمہ میں

پھر کفر کیا اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اب یہ کچھ نہیں سمجھتے۔[۴]

انہیں دیکھو تو اِن کے جُثّے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں۔ بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ۔[۵] مگر اصل میں

دونوں معنی درج کر دیتے ہیں پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن قسموں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی جگہ محفوظ کر لینے کے بعد وہ اپنے لیے ایمان کے تقاضے پورے نہ کرنے اور خدا اور رسُول کی اطاعت سے پہلُو تہی کرنے کی آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنی اِن جھوٹی قسموں کی آڑ میں وہ شکار کھیلتے ہیں، مسلمان بن کر مسلمانوں کی جماعت میں اندر سے رخنے ڈالتے ہیں، مسلمانوں کے اسرار سے واقف ہو کر دشمنوں کو اُن کی خبریں پہنچاتے ہیں، اسلام سے غیر مسلموں کو بدگمان کرنے اور خود سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں شبہات اور وسوسے ڈالنے کے لیے وہ وہ حربے استعمال کرتے ہیں جو صرف ایک مسلمان بنا ہوا منافق ہی استعمال کر سکتا ہے، کھلا کھلا دشمنِ اسلام اُن سے کام نہیں لے سکتا۔

[۴] اس آیت میں ایمان لانے سے مراد ایمان کا اقرار کر کے مسلمانوں میں شامل ہونا ہے۔ اور کفر کرنے سے مراد دل سے ایمان نہ لانا اور اُسی کفر پر قائم رہنا ہے جس پر وہ اپنے ظاہری اقرارِ ایمان سے پہلے قائم تھے۔ کلام کا مدعا یہ ہے کہ جب انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر سیدھے سیدھے ایمان یا صاف صاف کفر کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے یہ منافقانہ روش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور ان سے یہ توفیق سلب کر لی گئی کہ وہ ایک سچے اور بے لاگ اور شریف انسان کا سا رویہ اختیار کریں۔ اب ان کی سمجھ بوجھ کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ ان کی اخلاقی حس مر چکی ہے۔ انہیں اس راہ پر چلتے ہوئے کبھی یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ شب و روز کا جھوٹ اور یہ ہر وقت کا مکر و فریب اور یہ قول و فعل کا دائمی تضاد، کیسی ذلیل حالت ہے جس میں انہوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر لیا ہے۔

یہ آیت من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اللہ کی طرف سے کسی کے دل پر مُہر لگانے کا مطلب بالکل واضح طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان منافقین کی یہ حالت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی تھی اس لیے ایمان ان کے اندر اُتر ہی نہ سکا اور وہ مجبوراً منافق بن کر رہ گئے۔ بلکہ اس نے ان کے دلوں پر یہ مُہر اس وقت لگائی جب انہوں نے اظہارِ ایمان کرنے کے باوجود کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کر لیا تب ان سے مخلصانہ ایمان اور اس سے پیدا

یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چُن کر رکھ دیئے گئے ہوں۔[۶] ہر زور کی آواز کو یہ اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔[۷]
یہ پکّے دشمن ہیں،[۸] ان سے بچ کر رہو،[۹] اللہ کی مار ان پر،[۱۰] یہ کدھر اُلٹے پھرائے جا رہے ہیں۔[۱۱]

ہونے والے اخلاقی رویّہ کی توفیق سلب کر لی گئی اور اُس منافقت اور منافقانہ اخلاق ہی کی توفیق انہیں دے دی گئی جسے انھوں نے خود اپنے لیے پسند کیا تھا۔

۵ حضرت عبداللہ بن عبّاس بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن اُبَی بڑے ڈیل ڈول کا، تندرست، خوش شکل اور چرب زبان آدمی تھا۔ اور یہی شان اس کے بہت سے ساتھیوں کی تھی۔ یہ سب مدینہ کے رئیس لوگ تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو دیواروں سے تکیے لگا کر بیٹھتے اور بڑی لچھے دار باتیں کرتے۔ ان کے جُثّے بُشرے کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر کوئی یہ گمان تک نہ کر سکتا تھا کہ بستی کے یہ معززین اپنے کردار کے لحاظ سے اتنے ذلیل ہونگے۔

۶ یعنی یہ جو دیواروں کے ساتھ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، یہ انسان نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے کُندے ہیں۔ اُن کو لکڑی سے تشبیہ دے کر یہ بتایا گیا کہ یہ اخلاق کی رُوح سے خالی ہیں جو اصل جوہرِ انسانیت ہے۔ پھر انہیں دیوار سے لگے ہوئے کندوں سے تشبیہ دے کر یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ بالکل ناکارہ ہیں۔ کیونکہ لکڑی بھی اگر کوئی فائدہ دیتی ہے تو اُس وقت جبکہ وہ کسی چھت میں، یا کسی دروازے میں، یا کسی فرنیچر میں لگ کر استعمال ہو رہی ہو۔ دیوار سے لگا کر کندے کی شکل میں جو لکڑی رکھ دی گئی ہو وہ کوئی فائدہ بھی نہیں دیتی۔

۷ اس مختصر سے فقرے میں ان کے مجرم ضمیر کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ چونکہ وہ اپنے دلوں میں خوب جانتے تھے کہ وہ ایمان کے ظاہری پردے کی آڑ میں منافقت کا کیا کھیل کھیل رہے ہیں، اس لیے انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب ان کے جرائم کا راز فاش ہو، یا ان کی حرکتوں پر اہلِ ایمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ان کی خبر لے ڈالی جائے۔ بستی میں کسی طرف سے بھی کوئی زور کی آواز آتی یا کہیں کوئی شور بلند ہوتا تھا تو وہ سہم جاتے اور یہ خیال کرتے تھے کہ آ گئی ہماری شامت۔

۸ دوسرے الفاظ میں کھلے دشمنوں کی بہ نسبت یہ چھپے ہوئے دشمن زیادہ خطرناک ہیں۔

۹ یعنی ان کے ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔

۱۰ یہ بددعا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے بارے میں اِس فیصلے کا اعلان ہے کہ وہ اس کی مار

اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرے، تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ آنے سے رُکتے ہیں[۱۲]۔ اے نبی، تم چاہے ان کے لیے مغفرت کی دُعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے یکساں ہے۔ اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا[۱۳]۔ اللہ فاسق لوگوں کو ہرگز ہدایت نہیں دیتا[۱۴]۔

کے مستحق ہو چکے ہیں، ان پر اس کی مار پڑ کر رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے لغوی معنی میں استعمال نہ فرمائے ہوں بلکہ عربی محاورے کے مطابق لعنت اور پھٹکار اور مذمّت کے لیے استعمال کیے ہوں، جیسے اُردو میں ہم کسی کی بُرائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ستیاناس اُس کا، کیسا خبیث آدمی ہے وہ۔ اس لفظ ستیاناس سے مقصود اس کی خباثت کی شدت ظاہر کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کے حق میں بددعا کرنا۔

[۱۱] یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کو ایمان سے نفاق کی طرف اُلٹا پھرانے والا کون ہے۔ اس کی تصریح نہ کرنے سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اُن کی اِس اوندھی چال کا کوئی ایک محرّک نہیں ہے بلکہ بہت سے محرّکات اس میں کارفرما ہیں۔ شیطان ہے۔ بُرے دوست ہیں۔ ان کے اپنے نفس کی اغراض ہیں۔ کسی کی بیوی اس کی محرّک ہے۔ کسی کے بچے اس کے محرّک ہیں۔ کسی کی برادری کے اَشرار اس کے محرّک ہیں۔ کسی کو حسد اور بُغض اور تکبّر نے اس راہ پر ہانک دیا ہے۔

[۱۲] یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ رسول کے پاس استغفار کے لیے نہ آئیں، بلکہ یہ بات سُن کر غرور اور تمکنت کے ساتھ سر کو جھٹکا دیتے ہیں اور رسول کے پاس آنے اور معافی طلب کرنے کو اپنی توہین سمجھ کر اپنی جگہ جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ ان کے مومن نہ ہونے کی کھُلی علامت ہے۔

[۱۳] یہ بات سورۂ توبہ میں (جو سورۂ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوئی ہے) اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرما دی گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے منافقین کے متعلق فرمایا کہ "تم چاہے ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے دُعائے مغفرت کرو گے تو اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا" (التوبہ۔ آیت ۸۰)۔ آگے چل کر پھر فرمایا "اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر کھڑے ہونا۔ اِن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور یہ فاسق ہونے کی حالت میں مرے ہیں" (التوبہ آیت ۸۴)۔

یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کر دو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔ حالانکہ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہے، مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔[۱۵] حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے[۱۶]، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔[۲]

اے[۱۷] لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔[۱۸] جو

---

[۱۴] اس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو، اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار، خود اللہ کا رسول بھی مغفرت کی دعا کرے تو اسے معاف نہیں کیا جا سکتا دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے طالب نہ ہوں۔ اگر ایک بندہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑ رہا ہو، بلکہ ہدایت کی طرف اسے بلایا جائے تو سر جھٹک کر غرور کے ساتھ اس دعوت کو رد کر دے، تو اللہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی ہدایت لیے پھرے اور خوشامد کر کے اسے راہ راست پر لائے۔

[۱۵] حضرت زید بن ارقم کہتے ہیں کہ جب میں نے عبداللہ بن اُبَی کا یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا، اور اس نے آکر صاف انکار کر دیا اور اس پر قسم کھا گیا، تو انصار کے بڑے بوڑھوں نے اور خود میرے اپنے چچا نے مجھے بہت ملامت کی، حتیٰ کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ حضورؐ نے بھی مجھے جھوٹا اور عبداللہ بن اُبَی کو سچا سمجھا ہے۔ اس چیز سے مجھے ایسا غم لاحق ہوا جو عمر بھر کبھی نہیں ہوا، اور میں دل گرفتہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ پھر جب یہ آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر ہنستے ہوئے میرا کان پکڑا اور فرمایا لڑکے کا کان سچا تھا، اللہ نے اس کی خود تصدیق فرما دی (ابن جریر۔ ترمذی میں بھی اس سے ملتی جلتی روایت موجود ہے)۔

[۱۶] یعنی عزت اللہ کے لیے بالذات مخصوص ہے، اور رسول کے لیے بربنائے رسالت، اور مومنین کے لیے بربنائے ایمان۔ رہے کفار و فساق و منافقین، تو حقیقی عزت میں سرے سے ان کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

[۱۷] اب تمام اُن لوگوں کو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوں، قطع نظر اس سے کہ سچے مومن ہوں یا محض زبانی

لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اُس وقت وہ کہے کہ "اے میرے رب، کیوں نہ تُو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا"۔ حالانکہ جب کسی کی مہلتِ عمل پوری ہونے کا وقت آجاتا ہے تو اللہ کسی شخص کو ہرگز مزید مہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم
کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے ؏ ع

اقرار ایمان کرنے والے، خطاب کرکے ایک عام کلمۂ نصیحت ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ یہ بات اس سے پہلے ہم کئی مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید میں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے کبھی تو سچے اہلِ ایمان کو خطاب کیا جاتا ہے، اور کبھی اس کے مخاطب منافقین ہوتے ہیں کیونکہ وہ زبانی اقرار ایمان کرنے والے ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ہر طرح کے مسلمان بالعموم اس سے مراد ہوتے ہیں۔ کلام کا موقع و محل یہ بتا دیتا ہے کہ کہاں کونسا گروہ ان الفاظ کا مخاطب ہے۔

۲؎ مال اور اولاد کا ذکر تو خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان زیادہ تر انہی کے مفاد کی خاطر ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑ کر منافقت، یا ضعفِ ایمان، یا فسق و نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے، ورنہ درحقیقت مراد دنیا کی ہر وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے اندر اتنا مشغول کرے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جائے۔ یہ یادِ خدا سے غفلت ہی ساری خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اگر انسان کو یہ یاد رہے کہ وہ آزاد نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور وہ خدا اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے، اور اس کے سامنے جا کر ایک دن اسے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، تو وہ کبھی کسی گمراہی و بدعملی میں مبتلا نہ ہو، اور بشری کمزوری سے اس کا قدم اگر کسی وقت پھسل بھی جائے تو ہوش آتے ہی وہ فوراً سنبھل جائے۔

ترکی میں تحریکِ احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دَورۂ تُرکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۲)

لادینیت کے نفاذ کا ردِ عمل موصوف نے جب اپنی یہ داستان مکمل کر لی تو مَیں نے دریافت کیا کہ یہ واقعات تو ہمیں کسی نہ کسی حد تک معلوم ہیں، لیکن مَیں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مسلم عوام کا اس وقت ردِ عمل کیا تھا اور ملّتِ اسلامی نے ان تبدیلیوں کو کس طرح ہضم کر لیا، خاص طور پر عائلی قوانین کو کس حد تک عملاً قبول کیا گیا؟ وہ بتلانے لگے کہ شروع شروع میں تو عوام کے اندر ان تبدیلیوں کے خلاف سخت بے چینی اور غم و غصّہ کا اظہار کیا گیا، مگر چونکہ مصطفیٰ کمال نے بلقان کی جنگوں کے اندر بعض اچھے کارنامے سرانجام دیئے تھے اس لیے لوگ اس کے بارے میں غلط فہمی میں رہے۔ مسٹر نائف درمیان میں وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ دراصل اِس تمام خرابی کی ذمہ داری فوزی چقماق پاشا کی گردن پر ہے۔ فوزی پاشا کو معلوم ہو چکا تھا کہ "غازی" نے اب اپنا راستہ بدل لیا ہے، مگر اس کے باوجود وہ خاموش رہے! ولی اللہ کر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ کُردوں نے اس لادینی نظام کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ ۱۳ فروری ۱۹۲۵ء کو ایک کُرد رہنما شیخ سعید نے، جو سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ تھے، تینوں مشرقی صوبوں کے اندر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ان تینوں صوبوں میں اکثریت کُردوں کی ہے۔ شیخ نے کُردوں کی دینی غیرت و حمیّت کو بھڑکا دیا اور باقاعدہ اعلانِ جہاد بلند کر دیا۔ کُردوں نے خلافت کی بحالی کا مطالبہ کھڑا کر دیا اور خلافت کے منصب کے لیے عبدالحمید ثانی کے بیٹے سلیم کا نام پیش کیا۔ مذکورہ تینوں صوبوں کو اپنے زیرِ اثر لانے کے بعد شیخ سعید دیار بکر کی طرف بڑھے اور آمد پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن کرد سلسلۂ جنگ کو جاری نہ رکھ سکے اور بالآخر انہیں شکست کھانی پڑی۔ دراصل مصطفیٰ کمال نے ترکی کے اندر وسیع پیمانے پر یہ بات پھیلا دی کہ "ترکی کو اس وقت شدید خطرہ لاحق ہے۔ ترکی کے دشمن انگریز، کُردوں کی پُشت پناہی کر رہے ہیں اور مال اور ہتھیاروں سے برابر ان کی مدد کر رہے ہیں"۔ مصطفیٰ کمال کے اِس جھوٹے پروپگنڈے نے

ناواقف عوام پر بُرا اثر کیا اور وہ کُردوں کی بغاوت ختم کرنے کے لیے مصطفیٰ کمال کے ہمنوا ہو گئے۔ کیونکہ ایک طرف ان کے سامنے مصطفیٰ کمال کی غیر اسلامی اصلاحات تھیں اور دوسری طرف خود وطن کی آزادی اور سالمیت کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ دو مہینے بھی نہ گزرے کہ مصطفیٰ کمال نے تُرک عوام کی مدد سے کُردوں کے خلاف سخت کارروائی کی اور اُن کی بغاوت کو فرو کر دیا۔ کُردستان کے اندر اس قدر قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا کہ پُورا علاقہ آگ اور خون میں نہانے لگا۔ "باغیوں" سے انتقام لینے کے لیے عدالتیں قائم کی گئیں جنہیں "آزادی کی عدالتیں" کہا گیا۔ بڑے بڑے کُرد سرداروں کو اِن عدالتوں کی طرف سے پھانسی، جلاوطنی اور قید کی سزائیں دی گئیں۔ کُرد عوام کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ صرف دیار بکر کے اندر جن قبائلی سرداروں کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا اُن کی تعداد چالیس تھی۔ شیخ سعید کو، جو قائدِ انقلاب تھے، سب سے آخر میں پھانسی دی گئی۔

تشدد کا دَور دورہ نائف آفندی نے اس بیان پر مزید اضافہ یہ کیا کہ کُردوں کے علاوہ اناطول کے دوسرے علاقوں میں بھی متعدد افراد نے "غازی" کی اصلاحات کے خلاف اقدامات کیے۔ مگر اُس وقت تشدّد کا اس قدر شدید دَور دورہ تھا کہ ہر شخص پس کر رہ گیا۔ فوجی جرنیلوں کی ایک ایسی ٹیم مصطفیٰ کمال کے ساتھ تعاون کر رہی تھی جو تُرک باشندوں کے ساتھ اجنبی فاتح فوج سے بھی بدتر سلوک کرتی تھی اور خاص طور پر مسلمان تُرک اُس کی نگاہ میں حد درجہ مبغوض تھا۔ کُردوں کی مسلح بغاوت کو ختم کرنے کے بعد اِن لوگوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ انہوں نے اب اپنے سیاسی حریفوں سے نمٹنا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۱ء میں اُن عناصر نے جو مصطفیٰ کمال کے لادینی اور تجدد پسندانہ افکار کے خلاف تھے، ایک جماعت کی تشکیل کی تھی جسے پہلے "جماعت دوم" کا نام دیا گیا اور بعد میں یہ "حزب احرار" اور "حزب جمہوری ترقی" کے ناموں سے مشہور رہی۔ یہ حزب مصطفیٰ کمال کی ری پبلکن پارٹی کی مخالف تھی۔ اس کے اندر تین طرح کے عناصر شریک تھے۔ کچھ خالص سیاسی لوگ، دوسرے دینی حلقے، اور تیسرے "نوجوان ترکی" پارٹی کے لیڈر۔ مصطفیٰ کمال کے بعض سابق حامی بھی، جو اب اُس کے خلاف تھے، اِس میں شامل ہو گئے تھے۔ اِس طرح سے "جماعت دوم" نے اچھی خاصی طاقت حاصل کر لی تھی۔ مگر کُردوں کی بغاوت کو بہانہ بنا کر مصطفیٰ کمال نے اِس پارٹی کو توڑنے کا حکم جاری کر دیا اور اس پر یہ الزام دھرا کہ کُردوں کی بغاوت کے اندر اِس پارٹی کا ہاتھ ہے، یہ وطن دشمن اور غداروں کا گروہ ہے۔ اور اِس کا وجود ملک اور قوم کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔ چنانچہ اِس اعلان کے بعد مصطفیٰ کمال نے شہروں

اور بستیوں کے اندر "آزادی کی عدالتیں" قائم کردیں۔ ایک ایک مخالف شخص کو ان عدالتوں کے اندر گھسیٹا گیا اور اُسے سزا دی گئی۔ مسٹر نالف نے بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ بتایا کہ اُس وقت پورے ملک کے اندر دیوِ استبداد رقص کر رہا تھا۔ جس شخص پر بھی یہ شُبہ گزر جاتا کہ یہ "اصلاحات" کا مخالف ہے اُسے یا تو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا یا اُسے سخت تعذیب کا نشانہ بنایا جاتا، یا ملک سے باہر نکال دیا جاتا۔ "غازی" کا جوشِ انتقام کہیں تھمتا نظر نہ آتا تھا۔ یوں اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے یہ شخص ترک ملت کا فرد نہیں ہے بلکہ کوئی غیر ملکی فاتح ہے۔ کیونکہ تشدد کا یہ انداز تو تاتاریوں نے بھی اِس سرزمین کے اندر روا نہیں رکھا تھا جب وہ سلجوقیوں کے آخری عہد میں یہاں حملہ آور ہوئے تھے۔ عوام سے انتقام لینے کے بعد "غازی" نے اپوزیشن کے لیڈروں کی طرف رُخ کیا۔ اپوزیشن کے لیڈر رؤف بے میری مراد "حزب دوم" کے رہنما ہیں۔ اُن پر نئی فردِ جرم یہ عائد کی گئی کہ ان لیڈروں نے اُس کے قتل کی سازش کی ہے جو بروقت افشاء ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان سب لیڈروں کو بھی جن میں کئی سیاسی اور دینی پیشوا اور بڑی بڑی قابلِ احترام ہستیاں تھیں، "آزادی کی عدالتوں" میں پیش کر دیا گیا۔ دوسری صف کے تمام لوگوں کو چوراہوں میں پھانسیاں دی گئیں۔ صرف صفِ اوّل کے چار افراد کو معافی دی گئی اور باقی سب دار و رسن کے حوالے کیے گئے۔ مسٹر نالف نے اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ عین اس وقت جب مخالفین کو شہر کے چوراہوں پر پھانسیاں دی جا رہی تھیں، "غازی" کے محل میں جو "شان کیا" کے اندر واقع ہے، رقص و سرود اور جام و مے کا دور چل رہا تھا۔ "غازی" خوش تھا کہ اُس نے اپنا راستہ پوری طرح صاف کر لیا ہے۔

عائلی اصلاحات کا حشر نالف آفندی اور دوسرے دوستوں کی اِس مفصل اور دلچسپ گفتگو نے ترکی کی تاریخ حاضر کے نہایت اہم پہلو اجاگر کر دیئے اور راقم الحروف اس لحاظ سے مطمئن تھا کہ یہ معلومات خود ترکی کی سرزمین کے اندر ترکی قوم کے اُن افراد سے دستیاب ہو رہی ہیں جو ان واقعات کے عینی شاہد ہیں یا اپنے بزرگوں کی زبان سے ان واقعات کو سن چکے ہیں۔ میرے سوال کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ عائلی قوانین کو کس حد تک اِس ملک کے اندر نافذ کیا گیا اور کیا فی الواقع ترکی کے مسلم معاشرے نے ان قوانین کی پابندی کی؟ شیخ عمر نصوحی، جواب اُٹھنے کے لیے کروٹ بدل رہے تھے، اور انہوں نے اپنا ہیٹ بھی سر پہ رکھ لیا تھا، اِس کا مختصر جواب دیتے ہوئے فرمانے لگے :

"ترکی کا موجودہ عائلی قانون دراصل سوئٹزرلینڈ کے سول لا سے ماخوذ ہے۔ بلکہ اُس کا مکمل چربہ ہے۔ مسیحی معاشرے کے قانون کو ترکی کے مسلم معاشرے میں اندھا دُھند نافذ کر دیا گیا۔ اب اِسے "ٹرکش سول لا" کہا جاتا ہے۔ اِس قانون نے وراثت کے تمام اسلامی احکام اور شخصی قوانین کو بدل ڈالا اور تعدد ازدواج کو بلاقید و شرط ممنوع قرار دے دیا۔ یہ قانون ۱۹۲۵ء میں مجلّۂ احکام کو منسوخ کر دینے کے بعد جاری کیا گیا۔ اب اسے ۴۳ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے مگر یہ کہنا کہ یہ قانون کامیاب ہوا ہے یا کسی حد تک بھی کامیاب ہوا ہے مشکل ہے۔ ہم نے ترکی کے مختلف طبقوں کی زبان سے مسلسل یہ شکایتیں سُنی ہیں کہ یہ قانون مالی، اخلاقی اور نفسیاتی ہر لحاظ سے معاشرے پر بارِگراں بن رہا ہے اور ترکی کی اجتماعی اور نظریاتی زندگی کے ساتھ بُری طرح متصادم ہے۔ اس نے ترکی کی شہری زندگی کے اندر بداخلاقی، آوارگی اور جنسی آزادی کو جنم دیا ہے۔"

"قانونی" شادیاں اور "شرعی" شادیاں شیخ عمر نصوحی نے اپنے حافظے پر بوجھ ڈالا اور اِس سلسلے میں اُس دور کی بعض دلچسپ معلومات بیان کیں جب کہ اِس قانون کے نفاذ کے لیے حکومت کے پُورے ذرائع حرکت کر رہے تھے اور جبر و استبداد ملک پر حکمرانی کر رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک دس سال کے نتائج پر موصوف روشنی ڈالتے ہوئے بتانے لگے:

"اِن دس سالوں کے اندر ۵ لاکھ ایسی شادیاں ہوئیں جو اس قانون کے خلاف تھیں۔ لوگ شریعتِ اسلامی کے مطابق نکاح منعقد کر لیتے تھے اور اُسے حکومت سے مخفی رکھتے تھے۔ بالآخر جب حکومت کے علم میں اِن خلاف ورزیوں کی مسلسل اطلاعات آنے لگیں تو حکومت کی طرف سے ایک ضمنی قانون جاری کیا گیا ——————— جس کی رُو سے ایسی غیرقانونی شادیوں کو "قانونی" قرار دے دیا گیا اور انہیں باقاعدہ رجسٹرڈ کر دیا گیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کو تمام سرکاری فیس معاف کر دی گئیں۔ ۱۹۳۵ء ہی میں اس نوعیت کا ایک اور "قانونِ معافی" صادر ہوا۔ اِن تفصیلات کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مذکورہ دس سالوں کے اندر خفیہ شادیاں ہوئیں۔ وہ اُن شادیوں سے دوگنی تھیں جو اِن سالوں کے اندر ترکی کے مختلف اضلاع میں سرکاری رجسٹروں میں درج کی گئیں۔ کیونکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اِس عرصہ میں رجسٹرڈ شادیوں کی تعداد تین لاکھ چھ ہزار کے قریب تھی جبکہ خفیہ شادیوں کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب تھی۔"

نئے عائلی قوانین کا انجام عائلی قانون کا یہ انجام میرے لیے حیرت انگیز تو تھا مگر ناقابلِ فہم نہیں تھا۔ اس لیے کہ خود پاکستان کے اندر اس قانون نے جو معاشرتی کشمکش پیدا کر رکھی ہے وہ لوگوں کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اس سے فرار کے لیے نئے نئے راستے نکالیں۔ پاکستانی قوم جو عرصۂ دراز تک غلامی کی زندگی بسر کرتی رہی ہے اور جس کی وجہ سے اُس کے اندر وہ بہت سی خصوصیتیں معدوم ہو گئی ہیں جو آزاد قوم کے شایانِ شان ہیں، اُس کے لیے بھی غیر اسلامی عائلی قانون گوارا کرنا مشکل ہو رہا ہے کجا کہ تُرک قوم، جو غلامی کی لعنت سے پاک رہی ہے اور جس کے پاس عائلی قوانین کا نہایت ترقی یافتہ نظام مجلّۂ احکام عدلیہ کی شکل میں موجود تھا۔ مَیں نے شیخ نصوحی سے درخواست کی کہ وہ اِس موضوع پر مزید روشنی ڈالیں۔ بلکہ مَیں نے اِس موضوع کے بارے میں اپنی شدید دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے عائلی قوانین کا خلاصہ بھی پیش کیا، اور انہیں یہ لطیفہ بھی سنایا کہ شروع شروع میں جب یہ قانون نافذ کیا گیا تو ایک یونین کونسل کے چیئرمین نے ایک شخص کو یہ وارننگ دی تھی کہ اُس نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری شادی ایامِ عدّت گزارنے سے پہلے کیوں کر لی ہے۔ شیخ اِس پر خوب ہنسے اور فرمانے لگے کہ ایسے لطائف کی ہمارے ہاں بھی کمی نہیں رہی۔ مگر درحقیقت تُرک عوام نے نئے عائلی قوانین کو دل سے ہرگز قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اِن قوانین کے اجراء کے بعد عوام کے اندر ایک اصطلاح چل پڑی جسے عربی میں "تخالُل" کہتے ہیں، یعنی "دوست گری"۔ یہ اصطلاح خفیہ طور پر شہروں سے نکلی اور قصبوں اور دیہات تک پھیل گئی۔ دوسرے معنوں میں یہ "خفیہ اصطلاح" ایک سے زائد شادی کے لیے جواز کا فتویٰ تھی۔ اور ہوسکتا ہے کہ اِسے رواج دینے میں بعض علماء کا ہاتھ ہو۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی شخص اسلامی طریقے کے مطابق دوسری شادی کر لیتا ہے اور قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے وہ دوسری بیوی کو باقاعدہ "بیوی" کہنے کے بجائے "دوست" (GIRL FRIEND) کہہ دیتا ہے تو قانون اس پر راضی ہو جاتا ہے اور شرعاً نکاح پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ اُس کا نکاح درست اور مطابقِ شریعت ہے۔ چنانچہ لوگ اپنے اپنے علاقوں میں حسبِ ضرورت دوسری شادیاں رچاتے اور جب قانون کی بازپُرس ہوتی تو کہہ دیتے کہ دوسری عورت میری دوست ہے۔ قانون اِس تاویل کے آگے دم بخود ہو جاتا۔ کیونکہ نئے قانون کی رُو سے دوسری "شادی" ممنوع تھی، "دوست گری" ممنوع نہ تھی۔ "قانونی بیوی" اور "شرعی بیوی" کا یہ فرق صرف ظاہری تھا۔ ورنہ حقوق و

فرائض میں دونوں یکساں ہوتی تھیں بلکہ اکثر علاقوں میں یہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔ شرعی بیویوں کی اولاد کو لوگ یا تو پوشیدہ رکھتے اور اسے سرکاری کاغذات میں درج نہ کرواتے اور یا قانونی بیوی کے کھاتہ میں درج کروا دیتے۔ ۱۹۳۵ء میں جب پانچ لاکھ غیر قانونی جوڑوں کو قانونی جوڑے تسلیم کر لینے کا قانون صادر ہوا تو اس قانون پر بحث کے دوران یہ بھی بتایا گیا کہ "ان ۵ لاکھ جوڑوں کے ساتھ ۱۰ لاکھ خفیہ بچے بھی موجود ہیں"۔ شیخ نصوحی نے کہا کہ ترکی معاشرے کے اندر جن الجھنوں کو سوئٹزرلینڈ کے سول لا نے جنم دیا ہے یہ اس کی صرف ایک مثال ہے۔ یہ قانون خود سوئٹزرلینڈ میں ناکام ہو چکا ہے۔ اور سوئٹزرلینڈ کا معاشرہ اس کی بدولت تمام مغربی معاشروں سے زیادہ بدتر حالت میں ہے۔ وہاں ہر سو جوڑوں میں سے ۲۵ سے زائد جوڑوں کا انجام طلاق پر ہوتا رہا ہے، اور اب تو یہ نسبت مزید بڑھ چکی ہے۔ مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کے عقلی دیوالیہ پن کا حال یہ تھا کہ اسلام کے بہترین عائلی قانون کو منسوخ کر کے ان لوگوں نے سوئٹزرلینڈ کا یہ ناکام قانون لا کر ترکی قوم پر مسلط کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ شیخ عمر نصوحی کے الفاظ میں ترک ملت نے مصطفیٰ کمال کی عائلی اصلاحات کو ہرگز قبول نہیں کیا، اور خاص طور پر ترکی کی دیہی آبادی میں تو ان اصلاحات کے خلاف آج تک شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے[1]۔ شیخ عجلت میں تھے۔ اور نماز تراویح کا وقفہ بھی کم تھا اس لیے یہ مجلس برخاست ہو گئی اور کل کی افطاری کے لیے پرنسپل صاحب کی طرف سے دوبارہ دعوت پیش کی گئی۔ مجلس کے اندر کمال داتے نامی ایک تاجر بھی موجود تھے جن کا اپنا کتب خانہ اور پریس ہے۔ گفتگو کے دوران تو وہ چپ چاپ بیٹھے رہے مگر جب ہم اٹھنے لگے تو یہ یوسف صالح قرجہ صاحب سے کہنے لگے کہ میں خلیل حامدی سے نشر و اشاعت کے موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ شیخ عمر نصوحی تو تشریف لے گئے اور پرنسپل صاحب بھی اپنے بعض معاملات میں مشغول ہو گئے، مگر دوسرے دوست دوبارہ بیٹھ گئے۔

اسلامی لٹریچر کی طباعت و اشاعت اسماعیل داتے صاحب نے بتایا کہ یغمور پریس کے نام سے ان کے پاس اچھا چھاپہ خانہ ہے۔ کتابوں کی ایک دکان بھی ہے۔ ان کا مقصد اسلامی فکر کا فروغ اور اسلامی لٹریچر کی اشاعت ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں ترکی زبان میں وسیع پیمانے پر شائع کریں اور پھیلائیں۔

---

[1] ترکی کے ایک اور اسلام پسند وکیل سے بھی ترکی کے دورِ عثمانی کے قانونی اور عدالتی نظام اور لادینی دور کی اصلاحات کے موضوع پر گفتگو ہوئی جسے ہم آگے چل کر نقل کریں گے۔

میں نے اُن سے دریافت کیا کہ مولانا مودودی کی جو کتابیں اب تک ترکی میں چھپ چکی ہیں اُن کی اشاعت اور ترویج کا کیا حال ہے؟ یوسف صالح قرجہ کی وساطت سے انہوں نے بتایا کہ مولانا مودودی ترکی کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کافی متعارف ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ میں وہ خاصے مقبول ہیں۔ طلبہ کا اسلام پسند عنصر بڑے شوق اور اہتمام سے مولانا کی کتابیں پڑھتا ہے۔ ان کتابوں کی مقبولیت میں حالات کے تغیر سے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس بنا پر میں چاہتا ہوں کہ بازار کی مانگ کا لحاظ کرتے ہوئے اِن کتابوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلایا جائے۔ طباعت اور ظاہری حُسن کا معیار بھی بلند سے بلند تر ہو اور قیمت بھی مناسب ہو۔ اسماعیل وائے صاحب نے پورے عزم و شیفتگی کے ساتھ کہا کہ میں اِن شرائط کے ساتھ کماحقہٗ مولانا مودودی کے لٹریچر سے بازار کو بے نیاز کر سکتا ہوں۔ مزید برآں میری آرزو ہے کہ مولانا مودودی کے افکار کو اس ملک کے اندر پھیلانے کی مجھے سعادت نصیب ہو۔ ۴۴-۴۵ برس کے اس وجیہ و شکیل تاجر کے یہ الفاظ بڑے خلوص اور قلبی نظافت کی غمازی کر رہے تھے اور میرا دل یہ سوچ رہا تھا کہ جس ملک سے اسلامی مطبوعات کو چُن چُن کر نکالا گیا تھا، اسلامی کتب خانوں کو تالے لگا دیئے گئے تھے اور اسلامی فکر و نظر کے حامل لٹریچر کے گاہکوں کو جیل خانوں کی ہوا کھلائی گئی تھی، وہ ملک اپنی اسلامیت سے پھر بھی بیگانہ نہ ہو سکا اور رُبع صدی کے اندر اندر اُس نے باہر سے زبردستی درآمد کردہ نظریات و خیالات کو مکھی کی طرح اُگلنا شروع کر دیا۔ راقم الحروف نے اسماعیل وائے صاحب کے جذبات کا پورا پورا شکریہ ادا کیا اور اُن سے عرض کیا کہ ترکی کے اندر مولانا مودودی کی کتابوں کے تراجم کی طباعت و اشاعت کا انتظام تُرکی ہی کے ایک دوست کو سونپا گیا ہے۔ میں اُن تک آپ کی خواہش پہنچا دوں گا اور خود مولانا مودودی مدظلہ العالی کے علم میں بھی لاؤں گا۔ یہ حضرات مناسب فیصلے سے آپ کو مطلع کر دیں گے۔ یوسف صالح قرجہ صاحب نے اسماعیل وائے صاحب کی بھرپور تائید کی۔ بلکہ انہوں نے بتایا کہ میں علامہ اقبال مرحوم کی کتاب "بالِ جبریل" کا ترکی میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ کتاب کا اکثر و بیشتر حصّہ مکمل ہو چکا ہے اور یہ ترجمہ بھی اسماعیل وائے صاحب ہی شائع کریں گے۔ یوسف صالح قرجہ صاحب کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ موصوف لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضلِ ادب کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود اردو زبان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ بالِ جبریل کے ترجمہ کا مسودہ بھی اُن کے پاس ہی تھا۔ انہوں نے بڑے فخر و انبساط کے ساتھ اُسے نکالا

اور ساقی نامہ کا ترجمہ سنانا شروع کر دیا۔ بلکہ انہوں نے خود اصل ساقی نامہ بھی مجھے اُردو میں سنایا۔ لہجہ اور تلفظ دونوں خوب تھے۔ عربوں کے اندر اُردو نوازی کی صرف دو مثالیں ملتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم، جنہوں نے علامہ اقبالؒ کے فارسی اور اُردو کلام کا عربی اشعار میں ترجمہ کیا ہے۔ اور دوسرے یمن کے نامور اسلامی رہنما مرحوم محمود محمد زبیری جنہوں نے مولانا حالیؒ کی مسدس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ان شاذ مثالوں کے سوا عربوں کے اندر اُردو سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کی۔ ترکوں کے اندر اُردو کی رغبت بہت دیکھی۔ (باقی)

اسلامی قانون کے بعض اہم امتیازات

ڈاکٹر مدکور کی تالیف "مدخل الفقہ الاسلامی" کی ایک فصل

ترجمہ: قاضی عبدالنبی کوکب

[ڈاکٹر محمد سلام مدکور، مصر کے اسلام پسند قانون دان ہیں۔ وہ ایک عرصے سے قاہرہ کے لا کالج میں اسلامی قانون کے صدرِ شعبہ چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے اسلامی قانون پر متعدد کتابیں تالیف کی ہیں۔ "مدخل الفقہ الاسلامی" ایک مختصر، مگر نہایت جامع اور پُر مغز تالیف ہے۔ جدید دور کو سامنے رکھ کر فقہ اسلامی کا مطالعہ کرنے والے، اس کتاب سے قیمتی رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔ کتاب کی یہی اہمیت اسے اُردو میں منتقل کرنے کی باعث بنی۔ ترجمہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ طباعت سے پہلے اس کی ایک فصل "ترجمان القرآن" میں اس لیے شائع کرا رہا ہوں کہ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ضروری مشورہ دے سکیں۔ کوکب]

فقہی احکام کی وسعت وہمہ گیری: فقہ اسلامی کے احکام، فرد، جماعت اور ریاست کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو شامل ہیں، خواہ یہ پہلو اللہ تعالیٰ کے اُن حقوق سے متعلق ہوں جو بندوں کے ذمّے واجب ہیں، یا اِن حقوق سے متعلق ہوں جو بندوں کے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں، یا ان حقوق سے متعلق جو معاشرتی نوعیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی دو بنیادی حصّوں میں منقسم ہو جاتی ہے:۔

(۱) حصّۂ عبادات (۲) حصّہ معاملات

(۱) حصّہ عبادات: یہ وہ افعال ہیں جن سے اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے۔ مثلاً: نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ ان افعال میں شریعت کا مطالبہ تعبدی (یعنی بندگی کی) نوعیت رکھتا ہے۔ اس لیے ان کے احکام

دوامی اور مستقل حیثیت کے حامل ہیں، ماحول اور زمانے کے تغیرات کے ساتھ تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ اس نوعیت کے احکام کی کوئی مثال کسی دنیوی قانون میں نہیں مل سکتی، کیونکہ یہ دنیوی قوانین بندے اور خالق کے درمیان پائے جانے والے رابطے سے قطعاً بحث نہیں کرتے۔ شریعتِ ربّانی میں یہ عبادات اس لیے نہیں مقرر کی گئیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی حاجت ہے۔ بلکہ یہ نظامِ عبادات انسان کو پیکرِ اطاعت و تسلیم بنانے کے لیے۔ اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کی برداشت کا خوگر کر دینے کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس نظام میں طہارت و نظافت، وقت کی قدر دانی اور پابندی، نیز خالق کے انعامات پر شکر گزاری کی تربیت بھی پائی جاتی ہے۔

نماز کا منظر دیکھیے۔ نمازی بندے کس شانِ تنظیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور صف بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں جبکہ ان کے جسم صاف اور دل پاکیزگی سے معمور ہوتے ہیں۔ روزہ نفس کی تربیت و تطہیر کرتا ہے۔ اسے خواہشات کی زنجیروں اور عادات کی قید و بند سے رہائی بخشتا ہے۔ مالدار اور تنگ دست دونوں کو محرومی اور حاجتمندی کے احساس میں سے گزار کر ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے جس سے متحارب طبقوں کے درمیان قرب و مودّت، اور ٹوٹے ہوئے دلوں کے درمیان وصل و محبت کی راہیں نکل سکتی ہیں۔ زکوٰۃ بھی یہ واضح کرتی ہوئی کہ سرمایہ دار کی املاک میں خستہ حال لوگوں کا حصہ شامل ہے، سوسائٹی کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے، اور معاشرے میں تعاون کی رُوح پھیلا دیتی ہے۔ حج صعوبتوں اور ناگواریوں کے تحمل کی تربیت دیتا ہے۔ اور رسمی زندگی کی بعض رسوم و عادات کے بندھنوں سے آزادی عطا کرتا ہے۔ مزید برآں یہ فرزندانِ توحید کی ایک عام سالانہ کانفرنس ہے جس میں مختلف اطرافِ ارض کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور بین الاقوامی مسائل معرضِ بحث میں لائے جاتے ہیں۔

فقہاءِ اسلام نے اُن احکام کو بھی عبادات ہی کے حصے میں شامل کیا ہے جو خاندانی زندگی کی تعمیر و تنظیم کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، کیونکہ شریعت کی طرف سے خاندانی زندگی کی ذمہ داریوں کو کماحقہ پورا کرنے کی ازحد تاکید کی گئی ہے تاکہ معاشرتی نظم انسانی زندگی کے شایانِ شان اسلوب کے مطابق چل سکے۔ خاندانی زندگی سے متعلق شرعی احکام کا خاکہ حسبِ ذیل ہے:

- نکاح کے احکام

• مردوزن کے باہمی تعلق کی حرام وحلال نوعیتیں۔

• حق مہر اور وہ سامان جو تفریق کی بعض صورتوں میں عورت کو دیا جاتا ہے۔

• تعلق ازدواج کے بعد متعلقہ حقوق ومسائل، مثلاً نان ونفقہ، نسب، ولایت (GAURDIANSHIP) اور رضاعت وغیرہ۔

• طلاق یا تفریق کے سبب رشتۂ نکاح کا ختم ہوجانا اور اس پر مرتب ہونے والے احکام۔

یہ سب وہ قوانین ہیں جنہیں آج کل شخصی قوانین (PERSONAL LAW) کہا جاتا ہے۔

۲۔ حصۂ معاملات | اس حصے میں وہ احکام وقوانین ہیں جن کی غرض وغایت اسلامی معاشرے کی ایسی تعمیر وتنظیم ہے جو انسان کے فطری تقاضائے مدنیت کے عین مطابق ہو، تاکہ انسانی تمدن ایسا انداز اختیار کرلے جو رشد وہدایت سے معمور زندگی کی تخلیق کرسکے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس حصے کے احکام کتاب وسنت میں اجمال کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ایسا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کے اہل امر اصحاب لوگوں کی مصلحتوں اور بدلتے ہوئے عرف ورواج کو مدنظر رکھ کر احکام کے اخذ واستنباط کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامی نے حصۂ معاملات پہ بنیادی رہنمائی کردی ہے کہ ان قوانین کا حقیقی مقصد لوگوں کی بہتری اور اجتماعی نظم وضبط کی محافظت ہے۔ اس کے بعد شریعت نے زیادہ تر کچھ اصولی احکام وقوانین بیان کردیئے ہیں، اور بقیہ تفصیلی جزئیات کو اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ اصولی قاعدوں کی روشنی میں فقیہانہ بصیرت کے تقاضوں کے مطابق طے ہوتے رہیں گے۔

بین الاقوامی قانون | شریعت کا یہ حصۂ معاملات اُن تمام قانونی گوشوں پر پھیلا ہوا ہے جن پر آج کے جدید قوانین مشتمل دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم کی متعدد سُورتوں[1] میں بین الاقوامی روابط کی ہدایات مذکور ہیں۔ اسی طرح بین الاقوامی قانون کے بہت سے پہلو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن معاہدات سے اور اُن پر مرتّب ہونے والے ایفائے عہد اور منسوخیٔ معاہدہ کے احکام سے بھی واضح ہوتے ہیں جو آپؐ نے مختلف اقوام وقبائل سے کیے[2]۔ اس کے

---

[1] مثلاً انفال، توبہ، فتح، اور ممتحنہ جیسی سُورتوں میں۔ (مؤلف)

[2] سیرت کی کتابوں میں ان متعدد معاہدات کے متن محفوظ ہیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مختلف گروہوں کے درمیان منعقد ہوئے۔ فقہائے کرام نے بین الاقوامی قانون کے سلسلے میں ان معاہداتِ نبوی کو استنباطِ احکام کے لیے ماخذ کی حیثیت دی ہے۔ (مؤلف)

بپیشِ نظر فقہائے اسلام نے اُمّتِ مسلمہ کے قانونِ صلح و جنگ کو، اور اس سے متعلقہ احکام و مسائل کو حصّۂ معاملات میں درج کیا ہے۔ قدیم مؤلفین انہی امور کو "سیر و مغازی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں فقہاء نے مسلمانوں کے اُن معاملات کو بھی اسی مذکورہ حصّۂ قانون میں شامل رکھا ہے، جو ذمّی، مُستامن اور حربی لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں[1]۔

ملکی قوانین فقہاء اسلام نے دستور (CONSTITUITION) اور نظم و نسق (ADMINISTRATION) سے متعلق مباحث کو بھی حصّۂ معاملات میں رکھا ہے اور ان مباحث کو "سیاست شرعیہ" کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔

اسی طرح مالی اور اقتصادی اُمور کے بعض پہلوؤں مثلاً عُشر، خراج، جزیہ، کنز، معدنی دولت اور زمین کی آباد کاری وغیرہ کو بھی اسی حصے میں درج کیا ہے۔ پھر فقہاء نے کتاب و سنّت کی ہدایات سے عدل و انصاف پر مبنی کچھ ایسے اجتماعی قوانین بھی اخذ کیے ہیں جو ملکیت اور اس سے استفادے کی حدیں واضح کرتے ہیں، اور ان قوانین کو بھی اسی حصّۂ معاملات میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ، لوگوں کے اقتصادی روابط کی قسمیں، حصُول ملکیت کے طریقے، نیز ان پر مرتب ہونے والی قانونی ذمّہ داریاں، اور ساتھ ہی ذمّہ داری کی اہلیّت کی شرطیں، یہ سب امور شرح و بسط سے بیان کر دیئے گئے ہیں۔

شرکت اور اس کی مختلف صورتوں کا مبحث بھی اسی حصّے میں درج کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس حصّۂ معاملات میں فقہائے کرام نے ایک انسان کی دوسرے انسان کے خلاف ظلم و زیادتی کی بحث بھی شامل کر لی ہے، اور اس کے لیے نہایت مفصل، مستحکم اور کاملۃً مبنی بر انصاف ضابطے مقرر کیے ہیں۔ یہ قواعد و ضوابط، جرم و جنایت (یعنی

---

[1] ذمّی وہ غیر مسلم ہیں جن کی حفاظت جان و مال کی ذمّہ داری مسلم حکومت نے قبول کر لی ہو، اور وہ مسلم حکومت کو اس کے عوض جزیہ ادا کرتے ہوں۔ مستامن وہ غیر مسلم ہے جو کافر مملکت سے مسلم مملکت میں عارضی طور پر امان حاصل کر کے داخل ہو۔ اگر اسی حیثیت کے ساتھ، مسلمان، کسی کافر مملکت میں داخل ہو تو وہ بھی مستامن کہلاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو جدید دور میں پاسپورٹ اور ویزا کے ذریعہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے رائج ہے۔ حربی اس کافر حکومت کے غیر مسلم باشندے کو کہتے ہیں جس نے مُسلم حکومت کے ساتھ کوئی معاہدۂ امن قائم نہ کر رکھا ہو۔ فقہاء نے اپنی تالیفات میں، غنیمت، عُشر، خراج اور جزیہ کے مسائل، نیز ذمیوں، حربیوں اور مستامنین کے احکام، "کتاب السیر" کے زیرِ عنوان بیان کیے ہیں۔ مثلاً ہدایہ کی دوسری جلد کے آخری ابواب میں "کتاب السیر" موجود ہے۔ (کوکب)

جارحانہ زیادتی) کی اُن تمام صورتوں پر محیط ہیں جو لوگوں نے نکالی اور استعمال کی ہیں، چاہے یہ جنایات جانی نقصان پہنچانے والی ہوں، اور چاہے کسی حصّہ جسم کے لیے، انسانی عزت و آبرو کے لیے، یا مال و دولت کے لیے ضرر رساں ہوں۔ پھر اسی حصّے میں کچھ خاص ابواب ایسے بھی ہیں جن کا تعلق مقدمات و خصومات کے ساتھ ہے، مثلاً وہ ابواب جن میں قضا، دعویٰ، اور شہادت وغیرہ کے قوانین بیان ہوئے ہیں۔

فقہ اسلامی کی جامعیت | یوں آپ بجا طور پر محسوس کریں گے کہ فقہ اسلامی نے مسلمانوں کے امور و معاملات کے ہر گوشے کو قانون کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور جن امور پر کتاب و سنّت کی کوئی تصریحی ہدایت معلوم نہ ہو سکی، اُن پر بھی فقہاء اسلام اپنے طویل قانونی تجربے کے متوارث سلسلے میں مفصل اور منضبط قانونی معلومات پیش کرتے رہے یہاں تک کہ ہماری فقہ ایک ایسی پُرشکوہ اور باعظمت عمارت کی حیثیت اختیار کر گئی جو ایسی مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہے جن میں ہر جدید تعمیر کو نہایت عمدگی سے سہار لینے کی صلاحیت موجود ہے۔

اس گفتگو سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ علم فقہ جس طرح ان شرعی احکام سے بحث کرتا ہے جن پر کتاب و سنّت کی تصریحات موجود ہیں، اُسی طرح ان احکام سے بھی بحث کرتا ہے جن کے لیے کتاب و سنّت کی تصریحات تو دستیاب نہیں ہیں، لیکن شارع کی طرف سے کچھ ایسے امتیازی نشانات (INDICATIONS) نصب کر دیئے گئے ہیں جو غیر منصوص احکام کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ کیفیت مسائلِ عبادات میں بھی پائی جاتی ہے اور مسائلِ معاملات میں بھی۔ نیز یہ مسلمانوں کے احکام میں بھی موجود ہے اور غیر مسلموں کے احکام میں بھی۔ اس طرح فقہ اسلامی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس فقہ نے اپنے ہمہ گیر سرچشموں کی وسیع قوتوں کے ساتھ انسانی زندگی اور انسانی معاملات کے ہر پہلو کے لیے ایسے قواعد و ضوابط وضع کر دیئے ہیں جن کی رہنمائی میں اخذ و استنباط اور قیاس و اجتہاد کا عمل جاری رہتا ہے۔ اسی چیز نے اس قانون کو ہر دور کے تقاضے پورے کرنے والا اور ہر مقام و ماحول میں مناسب ترین ثابت ہونے والا بنا دیا ہے۔

اسلامی فقہ کا اجتماعی مزاج | فقہ اسلامی فرد اور سوسائٹی، دونوں کی بہبود کو مدِّنظر رکھتی ہے۔ مگر سوسائٹی کی بہبود کو اُس نے فرد کی بہبود پر بہر حال ترجیح دی ہے۔ اس لیے فقہ اسلامی یہ حق رکھتی ہے کہ اسے اجتماعی المزاج کہا جائے۔ اس حقیقت کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جس وقت کوئی فرد اپنے حق کا غلط استعمال کر کے کسی دوسرے فرد کو

نقصان پہنچاتا ہے، یا اس کے اختیارات عوامی بہبود کے ساتھ ٹکرا جاتے ہیں تو فقہ اسلامی اس موقع پر فرد کے حق اور اس کے اختیارات پر حد بندی کا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ کیونکہ عام دنیوی قوانین کے برعکس، قانونِ اسلامی کے نزدیک افراد کے حقوق از خود حاصل شدہ نہیں ہیں بلکہ وہ خالق کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور عوامی بہبود کی نگہداشت اور دوسرے افراد کے لیے غیر ضرر رساں ہونے کی شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔ لہٰذا فرد کو کسی عمل سے، جو اس کے لیے فی الواقع مباح بھی ہو کسی وقت روکا جا سکتا ہے جبکہ وہ عمل کسی دوسرے کے نقصان پر منتج ہو رہا ہو۔ وجہ ظاہر ہے۔ اجتماعی مصلحت، انفرادی مصلحت پر مقدم رکھی جاتی ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "اسلام میں ضرر اور ضرر رسانی کی گنجائش نہیں ہے"۔ اس فرمان کا منشاء یہی ہے کہ ہر ایسے فعل کا دفعیہ واجب ہے جو دوسروں کے لیے ضرر رساں ثابت ہو رہا ہو، اگرچہ وہ فی نفسہ مباح ہی کیوں نہ ہو۔ بعض احادیث نبویؐ سے اس قاعدے کی کچھ تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کی بیع پر بیع کرنے، اور دوسرے کی منگنی پر منگنی کرنے سے منع فرمایا ہے، ماسوا اس کے کہ وہ شخص ایسا کرنے کی اجازت دے دے۔ اسی طرح شُفعہ کا قانون بھی ہے، اور یہ شفعہ بیع و شراء کی آزادی پر ایک طرح کی حد بندی ہی تو ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ شریک یا ہمسائے کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ دوسرے افراد کے لیے نفی ضرر کا یہ قانونی رجحان نہایت اطمینان بخش چیز ہے جس سے حیات انسانی سعادت کے پہلو حاصل کرتی ہے اور انسانی معاشرہ تعمیری صلاحیتوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔

ہمارے فقہاء اس بات کے بھی قائل ہوئے ہیں کہ بعض حالات میں عوامی فائدے کے لیے فرد سے اس کی ملکیت کی کوئی چیز جبراً بھی لی جا سکتی ہے، مثلاً سڑک کشادہ کرنے، نہر نکالنے، مسجد، شفا خانہ یا مدرسہ بنانے کے لیے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مالک کو اس کی چیز کی واجبی قیمت ادا کر دی جائے۔ حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں اس کی مثالیں پیش آئی تھیں۔ چنانچہ ان دونوں خلفاء نے مسجد حرام کی توسیع کے لیے بعض صحابہ کے مکان ان سے خالی کرا لیے، حالانکہ وہ صحابہ اس پر معترض تھے، رضامند نہ تھے، کیونکہ وہ اپنی رہائش گاہ بیت اللہ کے قرب میں رکھنا پسند کرتے تھے۔

اسی طرح، فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ حکومت لوگوں سے غلے کے فالتو ذخائر حاصل کرے جبکہ فوج کو راشن پہنچانے یا کسی قحط زدہ علاقے کی مدد کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہو۔ کاریگروں سے جبراً کام لینا بھی ایسی

حالت میں جائز ہے جبکہ اجتماعی مفاد کے لیے وہ کام کرانا ضروری ہو گیا ہو۔

یہ اجتماعی نقطۂ نظر ایسا اہم اصلاحی اور عوامی نقطۂ نظر ہے جو اسلام کے برحق ہونے اور زندۂ جاوید ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ اس سے معاندین کی یہ الزام تراشی بھی بھسم ہو کر رہ جاتی ہے کہ اسلام کے احکام و قوانین، دنیا کے سابق قوانین مثلاً رومن لا وغیرہ، سے ماخوذ ہیں۔ آپ قانون کے اجتماعی المزاج ہونے کے اس پہلو ہی کو لے لیجیے کہ اسلام اسے تیرہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے پیش کرتا چلا آ رہا ہے اور دوسرے دنیوی قوانین آج کے جدید دَورِ تہذیب میں آ کر اس کی طرف رجوع کرنے اور اسے اپنانے لگے ہیں کیونکہ اس کے فقدان کی بنا پر انہیں سخت دقت اور ضرر کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، حالانکہ اسلامی قانون کی تاریخ میں ایسی صورتِ حال ایک دن بھی پیش نہیں آئی۔

اسلامی قانون کے امتیازات اسلام کے اجتماعی مزاج کی جہت سے آپ نے یقیناً محسوس کر لیا ہو گا کہ یہی وہ دینِ انسانیت ہے جو بقا اور دوامیّت کا پورا حقدار ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کا یہ استحقاق اور ثابت ہوتا چلا جاتا ہے، کیونکہ اس دین کی عمارت ٹھوس ستونوں اور نہایت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اسی سے آسمانی شرائع کا یہ پہلو بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کس ہمہ گیری کے ساتھ انسانی مسائل و ضروریات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ پھر یہی وہ پہلو ہے جو انسان کو دعوت دیتا ہے کہ اس کے لیے ان شرائع کی طرف رجوع کرنا اور ان کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو جانا لازم ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی ان میں صحیح غور کرتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ عائلی معاملات کی تدبیر و تنظیم میں ان شرائع کا کیا مقام ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حقیقت ذیل کے نکات سے مزید واضح ہو سکے گی۔

شریعتِ اسلامی تمام آسمانی شریعتوں کی خاتم، اُن میں سب سے بڑھ کر عالمگیر، اور ٹھیک اس خالقِ علّام کی جانب سے ہے جو مخفی حقائق کو جاننے والا ہے اور حرص و خطا سے منزہ ہے۔ یہی ایک ایسی شریعت ہے جو بغیر کسی کوتاہ دامنی کے، اور بغیر کسی کجروی کے، انسانی مسائل اور ضروریات کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔ مگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں یہ بات کہاں، اُن میں محدود فکرِ انسانی کارفرما ہوتی ہے جو اغراض اور خواہشات اور تعصبات کے فیصلوں سے متاثر ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات قواعد میں ٹھوکر کھا جاتی ہے، اور کبھی احکام کے اسباب میں غلط نتائج تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلامی شریعت، اپنی روحانی تعمیر اور نفسیاتی تہذیب کے ساتھ ضمیر کی بیداری کو تقویت دیتی ہے اور اس پاکیزہ دل سے پورا فائدہ اٹھاتی ہے جس کی اصلاحی قوتوں کے ساتھ تربیت کی جا چکی ہوتی ہے۔ پھر یہ پاکیزہ و شفاف

دل اپنی پاکیزگی کی بنا پر خود بخود خیر کو پسند کرتا ہے، بھلائیوں سے مستفید ہوتا ہے، اور شر کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن دنیوی قوانین کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ صرف ڈنڈے اور سزا کے خوف کے ساتھ اصلاحِ احوال کرتے ہیں اور اس طریق کار میں انسانوں کو بھی جانوروں کی طرح ہانک کر چلایا جاتا ہے۔ نہ ضمیر کی تربیت کی جاتی ہے اور نہ کوئی اخلاقی حس ابھاری جاتی ہے۔

یہ پہلو اس بات سے اور بھی زیادہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت نے انسان کے ہر عمل پر دو نوعیتوں کی جزا لازم قرار دی ہے۔ ایک وہ دنیوی جزا جس سے نچلے طبقوں کو درست چلایا جاتا ہے۔ اور دوسری وہ جزائے آخرت جو اونچی سطح کے لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دنیوی قانون محض دنیوی جزا کا تصور رکھتا ہے جو صرف اُس نچلے طبقے کے مناسب حال ہو سکتا ہے جسے بلند معیاروں تک رفعت حاصل نہیں ہوتی۔

پھر اسلامی شریعت خیر اور شر، دونوں قسم کے اعمال پر جزا مرتب کرتی ہے۔ نکوکار کو مستحق ثواب اور غلط کار کو مستلزم عقاب قرار دیتی ہے۔ لیکن دنیوی قوانین صرف شر کے پہلو پر جزا کو لازم کرتے ہیں اور سزا کے ذریعے سے اس کی مذمت کرتے ہیں۔ مگر اعمالِ خیر پر حسن جزا کا پہلو اِن قوانین کی حدود سے خارج ہے۔ اس لیے دنیا کے اِن وضعی قوانین میں بڑی سے بڑی صلاحیت بس یہی ہو سکتی ہے کہ وہ طبیعتوں میں کارِ خیر کے اختیار کرنے اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا کوئی جذبہ پیدا کیے بغیر اُن کا منتہائے ہمت بس یہ بنا دیں کہ انہیں سزا کے خوف کی وجہ سے افعالِ شر سے باز رہنا ہے۔ اور جب کسی کی طبیعت میں خلاف ورزی کی خواہش اُبھرے تو وہ عقوبت کے کوڑے سے بچنے کے لیے خفیہ حیلے تلاش کرتا پھرے۔ لیکن شریعت خداوندی کے ساتھ رابطہ رکھنے والے انسان کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ شریعت کے ساتھ اس کے رابطے کی بنیاد ہی یہ ہے کہ وہ خالق کی ذات پر سچا ایمان رکھتا ہے جو اسے ہر ایسے فعل کے قریب تک پھٹکنے سے روکتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ علمِ الٰہی ہر چیز کو محیط ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کو بعد موت پھر اٹھا کر اس کے ایک ایک عمل کا محاسبہ کرنے والا ہے۔

اور غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کے پہلو کو انسانی عقل و شعور کی پوری تائید حاصل ہے۔ عقل اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتی کہ موت کے بعد سارا سلسلہ ہی ختم ہو کر رہ جائے، نہ کوئی حساب و کتاب ہو اور نہ جزا و سزا۔

کیا عقل اس بات کو مان سکتی ہے کہ ایک نیک کردار، بافضیلت اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق سب حقوق ادا کرنے والے انسان کا انجام بھی ویسا ہی ہو جیسا کہ ایک شر پسند، رذائل کے مرتکب، لوگوں کے امن و سکون کو غارت کرنے والے اور ان کے املاک و ناموس پر دست درازی کرنے والے انسان کا ہونا چاہیے؟ پھر کیا وہ حکمران جو ظلم کی روش اختیار کرتا ہے؛ شہوت و لذت پرستی میں ڈوب جاتا ہے۔ اور لوگوں کی روزی، عزت و ناموس اور آزادی پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اُس حکمران کے مانند قرار دیا جا سکتا ہے جو عدل پسند ہو، عوام کی سلامتیٔ مال و جان کے بے فکر مند رہتا ہو، اور انسانیتِ فاضلہ کی راہوں پر لوگوں کو پوری آزادیاں عطا کرتا ہو؛ اس لیے آخرت کو تسلیم کرنا لازمی ہے جہاں ہر انسان کی عاقبت انصاف کے صحیح اصولوں کے مطابق مرتب ہو۔ یوں بندہ مومن، اپنے صحیح غور و تامل سے کام لیتا ہوا، ان راہوں پر بڑھتا چلا جاتا ہے جن پر انسانیتِ فاضلہ کی منزل حاصل ہوتی ہے۔ یہ بندہ مومن جہاں جاتا ہے، خیر و برکت اس کے ساتھ جاتی ہے۔ اور جہاں فرد کش ہوتا ہے، انصاف اور امن وہیں پڑاؤ کرتے ہیں۔

اسلامی شریعت میں اللہ نے قانون سازی کا ادارہ اہلِ ذکر علماء کے سپرد کیا ہے۔ یہ مجتہدین کرام ہیں جن پر شارع کی طرف سے یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ پیش آنے والے واقعات و حالات میں کتاب و سنت کی تصریحات سے احکام مستنبط کریں، یا پھر اسلام کے نظم قانونی کے مطابق شریعت کے رہنما اصولوں (امارات) سے احکام اخذ کریں اور اس فریضے کی ادائیگی میں ہر نا انصافی اور ہر انحراف سے دور رہیں۔

لیکن دنیوی قوانین میں قانون سازی کے اختیارات ریاست کے دستور کی طرف سے مقرر کردہ ایک خاص مجلس کے ہاتھوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں، جو بسا اوقات صحیح قانون سازی کے بجائے فاش غلطیوں کا ارتکاب کرتی رہتی ہے، مگر قانون سازی کا اختیار بہر حال اسی مجلس کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔

شریعتِ خداوندی اور دنیوی قوانین کے موازنے سے سب سے بڑا اہم نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی شریعت، جو بلاشبہ تمام آسمانی شرائع کی خاتم ہے، دو بنیادی امور کو بطورِ مقصد پیش نظر رکھتی ہے:

(۱) بندے کا اپنے خالق کے ساتھ صحیح رابطہ قائم کرنا۔

(۲) اور خود بندوں کے، ایک دوسرے کے ساتھ روابط کو درست طریقوں پر استوار کرنا۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہ پہلی چیز دوسری چیز کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

رسائل ومسائل

کویت میں امتناعِ شراب کا تجربہ

سوال: حال ہی میں کویت کی مسلم حکومت نے امتناعِ شراب کا مبارک اقدام کیا ہے۔ اس اقدام کی اطلاع آپ کو بھی ہو گی لیکن اسی کے ساتھ ایک افسوسناک پہلو میرے علم میں یہ بھی آیا ہے کہ دولت و اثر رکھنے والی کالی بھیڑیں کویت کے اس اقدام کو ناکام کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لے رہی ہیں۔ حکومتِ کویت اور وہاں کی اسلام پسند تنظیمیں اس الجھن کو حل کرنا چاہتی ہیں۔ کیا آپ اس بارے میں کوئی مشورہ دے سکتے ہیں؟

جواب: (از نعیم صدیقی صاحب)۔ اسلامی دنیا میں اب تک صرف ایک مملکت ــــ سرزمینِ حجاز ــــ شراب کی لعنت سے پاک رہی ہے۔ یہ اطلاع ہم سب مسلمانوں کے لیے باعثِ مسرت ہے کہ اب حکومتِ کویت نے بھی امتناعِ شراب کے لیے قانونی اقدام کر دیا ہے۔ مگر مسرت کے ساتھ ساتھ یہ پریشانی بھی آپ کی طرح ہمیں بھی لاحق ہے کہ آیا حکومتِ کویت ان بیرونی اور اندرونی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گی جو اس کے اس عظیم دینی اقدام کو ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں گی۔ تازہ خبروں اور لٹریچر سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق کویت میں امتناعِ شراب کے تجربے کو ناکام بنانے کے لیے پُرزور تخریبی حرکت کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور آپکے خط سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں باشندگانِ کویت اور مسلمانانِ عالم کو چند حقائق سے اچھی طرح آگاہ

(بقیہ: اسلامی قانون کے اہم امتیازات)

مگر جہاں تک دنیوی قوانین کا تعلق ہے، وہ فقط لوگوں کے باہمی معاملات ہی کی تنظیم و تنسیق کو مقصد بناتے ہیں، اور خالق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے مخلوق کے باہمی تعلقات کو درست کرنے کا مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ہونا چاہیے۔

تہذیبِ الحاد کی علمبردار مادہ پرست طاقتوں نے مسلمان معاشروں کو کمزور کرنے انہیں اپنا شکار بنائے رکھنے کے لیے جہاں فکری اور نظریاتی میدان میں طویل عرصے سے ایک غیر مختتم جنگ چھیڑ رکھی ہے وہاں مسلمانوں کی ایمانی و اخلاقی قوت کو تباہ کرنے کے لیے ان کے وسیع مسلم دشمن منصوبے کا ایک اہم جزو یہ بھی ہے کہ شراب۔ نمائش و پردگی بے حیائی، عریانی، ہوس آموز موسیقی، جنسیت انگیز رقص، اخلاق سوز فلموں، گندی تصویروں، اور سفلی رسالوں اور ناولوں کی وبا کو عالمِ اسلام میں عام کر دیا جائے۔ دورِ حاضر کی ہوس پرستانہ اور رندانہ ثقافت کے ان تمام عناصر کا مرکز جامِ شراب ہے جس طرح چاہِ بابل کی روایتی زہرہ نے اپنے اسیرانِ حُسن کو سب سے پہلے صہبا کی لہروں ہی میں غوطہ دیا تھا، اور پھر تمام جرائم کے لیے شرحِ صدر ہو گیا۔

واضح رہے کہ شراب، مُسکرات اور زنا کو پھیلانے کی اس انسانیت سوز مہم میں یہودی ادارے ساری دنیا میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، اور مستند مآخذ گواہ ہیں کہ غیر یہودیوں کو خراب کرنے کے لیے ان کے تیار کردہ تخریبی منصوبے کا یہ بہت بڑا حصہ ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ میں ۲ص کے برسرِ اقتدار طبقے کی گردن پر یہ اپنے سرمائے اور پبلسٹی کے اداروں کے ذریعے مسلسل مسلط رہے ہیں؛ امتناعِ شراب کے قانون کو ناکام بنانے کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔ امریکہ میں امتناعِ شراب کا قانون نافذ ہونے کے بعد دیس دیس سے شراب کی اعلیٰ اقسام بڑے پیمانے پر اسمگل کیں، خفیہ بھٹیاں قائم کیں، اور شراب کا زیرِ زمین کاروبار چلا کر دولت بھی خوب کمائی، اور امریکی حکومت اور معاشرے کے ایک اصلاحی اقدام کو ناکام بھی بنا کے چھوڑا۔ اس طرح اس اقلیتی عنصر نے سیاسی اور سماجی اور تجارتی لحاظ سے اپنے مخربِ اخلاق معرکے میں اکثریت پر فتح پالی۔

رہا مسلمان ممالک، اور خصوصیت سے عربوں کا معاملہ، سو یہودی مختلف ثقافتی پروگراموں اور کاروباری ذرائع کے پس پردہ بیٹھ کر عرصۂ دراز سے ہمارے معاشروں کو شراب اور فسق و فجور کا گھن لگانے کے لیے سرگرم کار ہیں۔ فلسطین میں اپنے ناجائز ریاستی وجود کو قائم رکھنے کی آدھی جنگ وہ اسی محاذ پر لڑتے چلے آرہے ہیں۔ اور کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مسلح جارحیت کی عیارانہ کامیابی سے پہلے مسلمان معاشروں کو اخلاق و ثقافت کے خاموش اور ٹھنڈے محاذوں پر شکستیں دی ہیں۔ یہیں سے ان کی مسلح جنگی کامیابی کا راستہ کھلا۔ یہ سوچنے کا مقام ہے کہ وہ

مسلمان معاشرے جن میں شراب و قمار کا دور دورہ ہو، جن میں نائٹ کلب ایک خصوصیت بن چکے ہوں، جن کے گھروں میں بے شرم مغربی تہذیب نے داخل ہو کر ڈیرے ڈال دیئے ہوں، جن کی عورتوں نے منی اسکرٹ کو اپنا مستقل لباس بنا لیا ہو، جن کو ریڈیو کے ہوس پرور گانوں اور ٹیلی وژن کے شہوت ناک مناظر نے محو کر رکھا ہو، جو آسائش اور نمائش کے سامانوں کو جمع کرنے کے سوا ہر قیمتی نصب العین گم کر چکے ہوں، وہ آخر اسرائیل کی منظم، متحد، منضبط، مذہب کی پرستار (جو کچھ بھی اُس کا مذہب ہو)، اور اپنے اجتماعی مقاصد کے لیے ایثار کیش اور نہایت مسلح قوم کی جارحیت کا مُنہ توڑ جواب کیسے دے سکتے ہیں۔

یہودی (علی الخصوص صیہونی) خوب جانتے ہیں کہ جس معاشرے میں شراب داخل ہو جائے گی اس میں نہ صرف قمار و ربٰو، رقص و سرود، زنا اور دوسرے جرائم از خود پھیلیں گے، بلکہ اس کی صحتیں بھی تباہ ہوں گی، اس کی قوتِ ارادی بھی مضمحل ہو گی، اس کی اخلاقی قدریں بھی برباد ہوں گی، حتیٰ کہ اس کا ایمان تک مضمحل ہو جائے گا، اور اس کی پوری زندگی کو گھن لگ جائے گا۔

ہم مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ شراب کی ایک بوتل، کوکین کی ایک گولی، اخلاق بگاڑنے والی ایک فلم، عُریانی پھیلانے والی ایک تصویر، جنسیت سے سرشار رقاصہ کا ایک غمزہ، شہوت پرور موسیقی کی ایک تان ہمارے لیے توپ کے گولے اور نیپام بم سے زیادہ تباہ کُن ہے۔

عرب ممالک کو تیل سے حاصل ہونے والی دولت نے بڑی بھاری آزمائش سے دوچار کر دیا ہے۔ کسی قوم کو جب دولت افراط سے ملنے لگے، اور خدا کی رحمت بغیر کسی لمبی چوڑی محنت کے اُس پر دُھن برسا دے تو ایسی دولت ذرا سی غفلت سے بہت بڑا فتنہ بن جاتی ہے۔ اس فتنہ سے بخیریت بچ نکلنے کی واحد راہ "شکر" کی راہ ہے۔ یعنی قوم کے سربراہ اس کے باثر طبقے اور عوام اس پر پھولنے اور اپھر جانے کے بجائے شکر و سپاس کی راہ اختیار کریں، اور دولت کا شکر ادا کرنے کا صحیح راستہ انفاق و ایثار ہے، نہ کہ نفس پرستی۔ انفاق افراد کے لیے بھی ہونا چاہیے اور مجموعی طور پر عوام کی بہبود کے لیے بھی۔ اور دینِ حق کے فروغ و غلبہ کے لیے بھی۔ تیل کی دولت کا بہترین مصرف پہلے دن سے یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار علمی و تحقیقی، رفاہی و خدمتی، دفاعی و عسکری اور صنعتی و سائنسی اداروں میں کھپا دی جاتی۔ مزید گنجائش نکلتی تو اس میں سے دوسرے پسماندہ مسلمان ملکوں کے

عوام کو حصہ دیا جاتا اور بعض مشترک بین الاسلامی فنڈز اور ادارے قائم کیے جاتے۔ اگر صرف پچھلے دس برس میں اس نقشے پر کام کیا گیا ہوتا تو اسرائیلی ریاست موجودہ قوت سے دگنی قوت جمع کر کے بھی عربوں کا بال تک بیکا نہ کر سکتی۔

لیکن سامراجی قوتوں کے دُور رس عیارانہ منصوبے بھی کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے جن مسلمانوں کو ڈالر اور پونڈ دیئے، (اور اب روبل دینے والے بھی میدان میں آگئے ہیں) اور دوسرے ہاتھ سے آرائش و آسائش، تفریح و تعیش اور فسق و فجور کے طرح طرح سامانوں کے انبار ان کے سامنے لگا دیئے۔ انہوں نے جام و مینا اور چنگ و رباب اور غیر حیادارانہ فیشنی لباسوں، نئے نئے ڈیزائنوں کی گراں بہا عمارتوں، اور طرح طرح کی رنگین و دلکش اشیاء کے بازار سجا دیئے۔ انہوں نے اپنی فاسقانہ تہذیب کی منڈی آراستہ کر کے تیل کی ادا کردہ رائیلٹی کا بڑا حصہ واپس اپنی جیب میں ڈالنے کی ایسی تدبیر اختیار کی جو دنیا کی دولت کا بہت بڑا حصہ وصول کرنے والے عربوں کو کبھی اپنے پیروں پر ایک مضبوط قوت بن کر کھڑا ہونے کے قابل نہ چھوڑے۔ کاش کہ ہمارے مسلمان ممالک، اور خصوصیت سے اہلِ عرب پچھلے دس سال کے اعداد و شمار مرتب کر کے دیکھیں کہ انہوں نے کتنا روپیہ ایسی اشیاء کی درآمد پر صرف کیا جو ان کی قوتوں کو تباہ کرنے والی تھیں۔ اور صنعت، زراعت، اسلحہ سازی اور دفاع کے لیے دولت کا استعمال کہاں تک ہوا۔

ان حالات کی روشنی میں ہم حکومتِ کویت کے مبارک اقدام (امتناعِ شراب) کا خیر مقدم کرتے ہوئے وہاں کے عوام اور خصوصاً با اثر طبقوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایک اسلامی قانون کے احیاء اور وقت کے ایک اہم تقاضے کو کامیاب بنانے میں بھرپور تعاون کریں۔ مگر ساتھ ہی ہمیں کویت کے حالات و کوائف کی روشنی میں یہ تشویش بھی لاحق ہے کہ تہذیبِ شراب و زنا کے دلدادگان اس مبارک اقدام کو ناکام بنانے کے لیے باہر سے بھی اور اندر سے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ امریکہ کی طرح کویت میں بھی تخریبی طاقتوں کو کامیابی حاصل ہو گئی اور حکومت کا اقدام ناکام رہا تو پھر نہ صرف یہ کہ شراب اور متعلقہ فسق و فجور کا طوفان اور زیادہ زور پکڑ جائے گا اور پھر کوئی امتناعی اقدام کرنا مشکل ہو جائے گا، بلکہ حکومت کے لیے اسلامی راہ پر مزید اصلاحی و تعمیری کوششیں کرنے کے راستے بھی بند ہو جائیں گے۔

اس سلسلے میں بیرونی قوتوں کا کارنامہ یہ ہے کہ ہماری اخباری معلومات کے مطابق شراب اور دیگر مسکرات کو کویت میں سمگل کر کے پہنچانے کے لیے ہر ممکن صورت اختیار کی جا رہی ہے۔ مثلاً لبنان سے آنے والے پھلوں کے

کریٹوں سے شراب کی بوتلیں برآمد ہوتی ہیں اور گمی کے کنستروں میں بھری ہوئی کوکین اور ہمنگ چرس پکڑی گئی ہے۔ اور اس سے زیادہ دردناک پارٹ اندر کے اُن نام نہاد مسلمانوں کے خوش حال اور با اثر طبقے کا ہے جو شراب کو اس طرح لازمۂ حیات بنا چکے ہیں کہ نہ انہیں قرآن اور ارشاداتِ رسول کا پاس ہے، نہ وہ شراب کے مفاسد و مضرات کی پروا کرتے ہیں، نہ وہ اُس سانحۂ عظیم سے عبرت کا کوئی درس لیتے ہیں جو جون ۶۷ء میں پیش آچکا ہے، اور نہ انہیں یہ احساس ہے کہ وہ اور تمام مسلمان کن کن مسلم دشمن قوتوں کے کیسے کیسے خطرناک منصوبوں سے دوچار ہیں۔ نفسانیت کے یہ اندھے مریض موٹروں میں بیٹھ کر ہفتہ وار چھٹی منانے کے لیے سیدھے بصرے جا پہنچتے ہیں اور وہاں ہفتہ بھر کی محرومیٔ شراب کا دل کھول کر حساب چکاتے ہیں۔

حکومت کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہی وہ طبقہ ہے اور یہی وہ مریضانِ نفسانیت اور مریدانِ تہذیب باطل ہیں جو —— خواہ مصر میں پائے جائیں، یا کویت میں یا کسی دوسرے مسلم ملک میں —— ہماری ساری تباہیوں اور شکستوں اور مصیبتوں کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا وجود ملت کے لیے ناسور بن گیا ہے اور واقعات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہی عنصر عربوں کی حالیہ شکست اور لاکھوں باشندگانِ فلسطین کی خانماں خرابی کا باعث ہے۔

اب جبکہ حکومتِ کویت نے ایک مفسدۂ عظیم کا قلع قمع کرنے کے لیے فیصلہ کُن قدم اُٹھا دیا ہے تو اسے کسی حال میں پیچھے نہ ہٹنا چاہیے، بلکہ اس پر قائم رہنے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے اس کو اس کی مخالفت میں کام کرنے والے بیرونی اور اندرونی دونوں عناصر کی پوری سختی سے سرکوبی کرنی چاہیے۔ کسی بھی کمزور اور ادھورے اقدام سے ہزار درجہ بہتر یہ ہوتا ہے کہ سرے سے کوئی اقدام کیا ہی نہ جائے۔ اور اگر قدم اٹھا یا ہی گیا ہو تو پھر وہ بھرپور ہونا چاہیے[1]۔

---

[1] ویسے بہتر تھا کہ حکمتِ اصلاح کے تحت تدریجی اقدام کیے جاتے۔ ایک سہ سالہ یا پنج سالہ منصوبہ بنایا جاتا جس کا منشا یہ ہوتا کہ موجودہ خوگرانِ معصیت پر آہستہ آہستہ پابندیاں لگائی جائیں، اور نئی نسلوں کو بچانے کے لیے مضبوط تدابیر اختیار کی جائیں۔ اب بھی اگر مناسب ہو تو دیرینہ خوگرانِ منشیات کے لیے (ایک خاص حدِ عمر مقرر کر دی جائے، مثلاً ۴۵ سال سے اوپر) حسبِ ذیل طریق تدریج سے انسدادی اقدام کیا جائے:۔ (باقی صفحہ ۵۵ پر)

بیرونی اور اندرونی عناصر کی شر انگیزیوں کا علاج کرنے کی تدبیریں یہ ہیں:

(۱) باہر سے زمینی، بحری اور فضائی راستوں سے آنے والے تجارتی اور نجی ہر قسم کے سامان کی نہ صرف کسٹم کا عملہ مکمل پڑتال کرے بلکہ کچھ عرصے کے لیے مختلف آبادیوں میں داخل ہونے پر سامان کا دوبارہ جائزہ لینے کے لیے خاص چوکیاں تمام راستوں پر قائم کی جائیں۔ اس غرض کے لیے زائد عملہ بھرتی کیا جا سکتا ہے۔

(۲) وہ تمام افراد جو شراب اور دوسری حرام چیزوں کی ناجائز طریقوں سے درآمد (سمگلنگ) کے جرم پائے جائیں، ان کو نہایت سنگین سزا دی جائے۔ خواہ وہ لمبی قید یا مشقت کی صورت میں ہو، یا ضبطی جائداد کی شکل میں، یا کوڑوں اور تازیانوں کی صورت میں (اور یہ مختلف سزائیں جمع بھی کی جا سکتی ہیں)۔ یہ محض عام قسم کی سمگلنگ نہیں ہے بلکہ یہ خلاف ورزی شریعت، معاشرے کی اخلاقی تباہی کی کوشش اور حکومت کے مطابقِ دین تعمیری و اصلاحی فیصلوں کو ناکام بنانے کی کوشش بھی ہے۔ یہ ایک جرم بہت سے بڑے بڑے جرائم کا مجموعہ ہے۔ اس تعزیری معاملے میں جلاوطنی یا سزائے موت تک دی جا سکتی ہے۔

(۳) باہر کی جن فرموں یا جن تاجر اشخاص کے بھیجے ہوئے سامانوں میں سے شراب وغیرہ برآمد ہو، ان کو کویت میں تجارت جاری رکھنے کے حق سے کسی خاص مدت (مثلاً ۵ سال) کے لیے محروم کر دیا جائے۔

(۴) اس قسم کی اسمگلنگ کا ذریعہ اگر کوئی موٹر گاڑی وغیرہ ہو تو اسے ضبط کر لیا جائے، اور باہر کا کوئی بحری یا ہوائی جہاز ہو تو اس کی کمپنی کے جہازوں کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ اور اگر خود کویت کی کسی کمپنی کے جہاز کو استعمال کیا گیا ہو تو اس پر نہ صرف بھاری جرمانہ کیا جائے بلکہ سمگلنگ کے ذمہ دار افراد (یا جنہوں نے مال لادتے ہوئے جانچ پڑتال میں کوتاہی برتی ہو) کو تحقیقات کے بعد سزا دی جائے۔

(بقیہ ص۵۴) (۱) کوئی شخص جو شراب یا ایسی کوئی دوسری چیز استعمال کرتا ہو، اُسے ایک متعین مدت کی مہلت دی جائے۔

(۲) اسی دوران میں اس کے لیے لازم قرار دیا جائے کہ وہ باقاعدہ اقرار نامہ اس حلفیہ وعدے کے ساتھ داخل کرے کہ وہ اس حرام چیز کو ترک کرنے کی سعی کرے گا اور اپنی سعی کی ماہانہ رپورٹ داخل کرے گا۔

(۳) ایسا اقرار نامہ داخل کرنے والے کے لیے بھاری فیس مقرر کی جائے، اور اس فیس میں ہر مہینے اضافہ کیا جاتا رہے

(۴) اس مہلت کی مدت ختم ہونے کے بعد جو شخص بھی شراب پیے اسے وہی سزا دی جائے جو شریعت میں مقرر ہے۔ پھر اس امر کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے کہ اس جرم کا مرتکب کون ہے۔

(۵) ایسے تمام افراد پر سی آئی ڈی مامور کر دی جائے جن کے متعلق حکومت کے نوٹس میں یہ بات آجائے کہ وہ شراب کے عادی ہیں اور قانونِ امتناع کے بعد بھی اسے ترک نہیں کر رہے۔ ان کی فہرستیں تیار کی جائیں اور پھر ان کی کڑی نگرانی کی جائے۔ ان میں سے جو لوگ کویت سے باہر جا کر شراب پیتے ہوں (اور اس کے لیے مصدقہ رپورٹ مل جائے) ان کو کویت سے باہر نکلنے سے روک دیا جائے۔ باہر بھی خفیہ نگرانی کے انتظامات کیے جاسکتے ہیں۔

(۶) درآمدی مال کی جانچ پڑتال کرنے یا عادی شراب نوشوں کی نگرانی کرنے والا عملہ اگر اپنے کام میں کوتاہی دکھائے تو اس کے مجرم افراد کو بھی عبرت ناک سزا دی جائے۔

(۷) تمام ہوٹلوں، کلبوں، قہوہ خانوں اور تفریحی مراکز کی کڑی نگرانی کی جائے، اور جہاں ذرا بھی شبہ ہو فوراً تلاشی لی جائے۔

(۸) دواؤں کی دکانوں پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

(۹) سرکاری ملازمین اور شہریوں میں اعلان کر دیا جائے کہ شراب نوشی کی کسی مجلس، یا شراب کے کسی اسٹاک کی صحیح مخبری کرنے یا حالتِ نشہ میں کسی شراب نوش کو گرفتار کرانے پر اُن کو حکومت کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔

(۱۰) ایک خاص مدت مقرر کر دی جائے (مثلاً ۶ ماہ) کہ اگر اس مدت میں کوئی شخص (قانون کی سزا بھگت کر بھی) مسلمان رہتے ہوئے شراب ترک نہ کرے اور خلاف ورزیٔ شریعت پر بضد ہو تو اس کے لیے حسبِ ذیل صورتوں میں سخت ترین کارروائی کی جائے:۔

— وہ اگر کسی سرکاری ملازمت میں ہو تو اسے برطرف کر دیا جائے۔

— وہ اگر کسی کاروباری فرم میں حصہ دار ہو تو اس کا حصہ ضبط کر کے ختم کر دیا جائے۔

— وہ اگر کوئی املاک رکھتا ہو تو وہ سب ضبط کر لیے جائیں۔

— اسے تائب ہونے تک قید میں رکھا جائے۔

(۱۱) ان تدابیر کی پشت پر تعلیم و تلقین اور نشر و اشاعت (پریس، ریڈیو وغیرہ) کے تمام ذرائع کو کام میں لایا جائے، جلسے منعقد کرائے جائیں، تنظیمیں قائم کی جائیں، پوسٹر اور کتبے جگہ جگہ چسپاں کر دیئے جائیں اور عوام کے لیے نعرے اور ماٹو وضع کیے جائیں

لیکن ان ساری تدبیروں کے ساتھ دو اصولی باتیں لازم ہیں :۔

اوّلاً، یہ کہ حکمران خاندان کے طبقے کا کوئی فرد شراب یا نشہ آور چیزوں کے استعمال میں خود ملوث نہ ہو، کسی سرکاری محفل یا محل یا ادارے یا دفتر یا تقریب یا ضیافت میں شراب کا ایک قطرہ بھی داخل نہ ہونے پائے ۔

ثانیاً ۔ امتناعِ شراب اور اس سے متعلقہ قوانین و احکام کی خلاف ورزی کرنے والا چاہے کسی بھی سیاسی، سماجی یا اقتصادی مرتبے کا ہو، اس کا کوئی لحاظ کیے بغیر اُسے شکنجۂ عقوبت میں کسا جائے ۔

اِن دو شرطوں کو پُورا کرنے میں اگر ذرہ بھر بھی رخنہ رہ گیا تو پھر نہ اوپر کی بیان کردہ تدابیر کامیاب ہو سکتی ہیں اور نہ حکومت اپنے شاندار اقدام پر مضبوطی سے قائم رہ سکتی ہے ۔

ان خیر خواہانہ گذارشات کے ساتھ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے حکومتِ کویت امتناعِ شراب کی مہم میں کامیاب ہو کر دوسرے مسلمان ممالک کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کرنے کے قابل ہو سکے ۔

(نوٹ : اس جواب کا عربی ترجمہ کویت بھیج دیا گیا ہے)

مطبوعات

کتاب الرسالہ | تالیف: امام ابن ادریس شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ ترجمہ: مفتی محمد امجد علی صاحب۔ شائع کردہ: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل۔ مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی۔ صفحات: ۴۸۴۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے۔

زیرِ نظر کتاب امام شافعی رحمۃ اللہ کی مشہور تصنیف الرسالہ فی اصول الفقہ والحدیث کا ترجمہ ہے۔ یہ بیش قیمت تصنیف اصول فقہ و اصول حدیث پر سب سے پہلی کتاب شمار ہوتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ ہماری امت کے بڑے سے بڑے مجتہد سنت کو قرآن مجید کے بعد اسلامی قانون کا سب سے بڑا ماخذ قرار دیتے تھے کیونکہ حضور سرورِ کائنات کے اقوال و اعمال کا سرچشمہ بھی وحی الٰہی ہی ہے۔ امام موصوف کے نزدیک اگر صحتِ روایت سے انکار ممکن نہ ہو تو متنِ حدیث کو معروضی تنقید کے ذریعے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب درحقیقت رسوخ فی العلم کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ترجمہ سلیس اور رواں ہے اور فاضل مترجم کی استعداد کا آئینہ دار۔

اسلام کا نظریہ ملکیت حصہ اول | تالیف ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالمی مارکیٹ لاہور۔ صفحات: ۳۰۴۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن مع پلاسٹک کور: ۵.۰۰ روپے۔ سستا ایڈیشن: ۴.۰۰ روپے

اس کتاب کے مصنف پاک و ہند کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مغربی اور اسلامی علوم دونوں میں وہ گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ اس تصنیف میں انھوں نے اسلام کے نظریہ ملکیت پر بحث کی ہے۔ اُن کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اسلام میں ملکیتِ مطلق کا تصور نہیں بلکہ امانت کا تصور ہے یعنی ہمیں جس شے پر تصرّف حاصل ہے اسے ہم مطلق العنان ہو کر استعمال نہیں کر سکتے بلکہ امین کے طور پر اس کے اصل حاکم یعنی باری تعالیٰ کے حکم کے مطابق فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ اسی حقیقت کو فاضل مصنف نے سارے مباحث کی بنیاد بنایا ہے۔ پوری کتاب بڑی وقیع اور فاضلانہ ہے۔ اور

مصنف کے وسیع مطالعہ کی شہادت دیتی ہے۔ البتہ اس ضمن میں دو باتیں ہمارے نزدیک قابل غور ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام دولت کو (جس کا انفرادی ملکیت ایک مظہر ہے) کیا مقام دیتا ہے۔ دوسرے تبصرہ نگار کے نزدیک تسخیر کائنات کا وہ مفہوم بھی محل نظر ہے جو فاضل مصنف نے بیان کیا ہے۔ قرآن نے ہمیں اس سلسلے میں جو کچھ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ موجود ہے اُسے ہمارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ ہمیں اب صرف اُس سے استفادہ کرنا ہے۔ تسخیر کائنات کا مروجہ تصور دراصل مغرب سے آیا ہے۔ جس کے مطابق انسان اور کائنات کی دوسری قوتوں کے درمیان ایک کشمکش برپا ہے فطرت انسان کو سرنگوں کرنے کی فکر مند رہتی ہے اور انسان فطرت پر بالادستی قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ مغربی تصور کی رُو سے انسان کا کائنات کے بارے میں اور کائنات کا انسان کے بارے میں رویہ معاندانہ ہے۔ اور اس بنا پر انسان قوت کے زور سے اس بپھری ہوئی قوت کو زیر کرنے کے درپے رہتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس تصور کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے ذرائع و وسائل کو ہدیہ کے طور پر انسان کے سامنے پیش کر دیا ہے اور اس سے یہ کہا ہے کہ اب تم اس سے میری منشا کے مطابق فائدہ اٹھاؤ۔ تبصرہ نگار کو امید ہے کہ کتاب کے فاضل مصنف دوسرے حصے کی ترتیب و تدوین میں ان گذارشات پر غور فرمائیں گے اور اس طرز فکر کے طبیعی نتائج کو ملحوظ خاطر رکھ کر بحث کو آگے بڑھائیں گے۔

اسلام کا معاشرتی نظام | تالیف: جناب خالد علوی صاحب استاد شعبہ علوم اسلامی، جامعہ پنجاب لاہور۔ شائع کردہ: المکتبۃ العلمیہ ۱۵۔ لیک روڈ۔ لاہور۔ قیمت: نو روپے۔ صفحات: ۳۸۴۔

زیر تبصرہ کتاب اگرچہ بنیادی طور پر ایک نصابی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے لیکن درحقیقت اس کی اشاعت سے اسلامی نظام حیات کے ایک نہایت ہی اہم گوشے کی نقاب کشائی ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موضوع پر ہمارے ہاں بڑی وقیع کتب ملتی ہیں۔ خصوصاً فقہ اسلامی میں معاشرتی امور پر بڑی مستند اور سیر حاصل بحثیں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اسلام کے معاشرتی نظام کو نئے حالات کو سامنے رکھ کر نئے اسلوب نگارش میں پیش کیا جائے۔ پروفیسر خالد علوی صاحب نے بڑی عمدگی سے اس فرض کو سرانجام دیا ہے۔ کتاب ٹائپ میں نہایت اچھے طباعتی معیار پر شائع ہوئی ہے۔ ٹائپ کی اغلاط البتہ زیادہ ہیں اور انہیں درست کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

اسلام اور اہل کتاب
ISLAM VERSUS AHL KITAB

تالیف: محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ۔ شائع کردہ: جناب محمد یوسف خاں، سنت نگر، لاہور۔ قیمت ۱۲ روپے۔ صفحات ۲۲۰۔

اس کتاب میں اُن سازشوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو کہ صیہونیت اور عیسائیت کے علمبردار اسلام کے خلاف کر رہے ہیں اور مبلغئے اسلام کو ان کے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مصنفہ نے جو بات کہی ہے اس کے لیے ٹھوس دلائل پیش کیے ہیں اور صیہونی اور عیسائی مصنفین کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن کے سامنے مذہب سے وابستگی کا بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ کسی طرح اسلام اور مسلمانوں کو برباد کیا جائے۔

کتاب کا پہلا باب جس میں محترمہ مریم جمیلہ نے اپنے مسلمان ہونے کی داستان قلمبند کی ہے، ان کے خلوص اور اسلام سے گہری عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ کتاب کے صفحہ ۲ پر ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جن الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے وہ مناسب نہیں۔ ہمیں اس بات کی توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ الفاظ بدل دیئے جائیں گے۔

مشاہیرِ اسلام

تالیف: ڈاکٹر امیر حسن صدیقی، پروفیسر و صدر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی۔ مترجم: جناب امین احمد صاحب۔ شائع کردہ: جمعیت الفلاح کراچی۔ قیمت درج نہیں۔ صفحات ۱۷۳۔

اس کتاب میں تاریخ اسلامی کے نامور استاد نے اُمتِ مسلمہ کی ۱۲ عظیم شخصیتوں کے حالات بڑے سلجھے ہوئے انداز میں قلمبند کیے ہیں۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے علاوہ اس کتاب میں حضرت عمر بن عبدالعزیز، خلیفہ ابو جعفر المنصور، خلیفہ ہارون الرشید، خلیفہ المامون، امیر عبدالرحمٰن الداخل، امیر ہشام اور خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے حالاتِ زندگی شامل ہیں۔ جناب امین صاحب نے ان مقالات کو انگریزی زبان سے بڑی عمدگی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ معیارِ طباعت اچھا ہے۔

النبیؐ الخاتم

تالیف: مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور۔ شائع کردہ: مکتبہ رشیدیہ، لاہور۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ساڑھے چار روپے۔

دنیا میں شاید ہی کسی انسان کی زندگی پر اتنا لکھا گیا ہو جتنا کہ حضور سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ پر لکھا گیا ہے۔ حضورؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر لاتعداد تصنیفات موجود نہ ہوں مگر اس مقدس زندگی میں ایسی کشش ہے کہ ہر نئی تصنیف یا ہر نیا مقالہ ایک نئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دوسرے یہ بات بھی عجیب ہے کہ جن مسلمان مصنفین نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اُن میں حضورؐ کی سیرتِ پاک کا عنوان سب سے زیادہ روشن اور درخشاں دکھائی دیتا ہے۔

اس کتاب کے مصنف مولانا گیلانی نے سینکڑوں مقالات اور درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں بعض کتب بڑی جاندار اور معلومات افزا ہیں اور مصنف کے گہرے علم اور دلاویز طرزِ نگارش کی شہادت فراہم کرتی ہیں مگر زیرِ تبصرہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود اُن کی ساری تصنیفات پر فوقیت رکھتی ہے اور اس کا اندازِ تحریر سب سے جداگانہ اور الگ ہے۔ مکتبہ رشیدیہ لاہور نے اس قابلِ قدر تصنیف کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

THE MYSTRIES OF PURITY تالیف: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ۔ مترجم: نبیح امین فارس۔ شائع کردہ: شیخ محمد اشرف صاحب، کشمیری بازار، لاہور۔ صفحات ۹۶ قیمت چھ روپے۔

اسلامی مصنفین میں غالباً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اہلِ یورپ کی نظر میں سب سے زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ابن سینا، ابن رشد اور ابن خلدون کے ساتھ اُن کی دلچسپی کی وجہ تو یہ ہے کہ اُن کے افکار کے کچھ حصے ایسے ہیں . . . . جو ان کی نظر میں یورپ کے نظریات سے کسی حد تک قریب ہیں لیکن امام غزالی کی شہرت کی وجہ کلامی مباحث میں اُن کا بڑا عالمانہ طرزِ استدلال، مادیت پرستی پر ان کی جاندار تنقید اور اصلاحِ نفس کے لیے اُن کی عملی اور موثر تدابیر ہیں۔ پاکستان میں انگریزی کتب کے معروف ناشر نے دنیائے مغرب کو امام غزالی کی تعلیمات سے روشناس کروانے کے لیے امام صاحب کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کے ترجمے کی اشاعت کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اس کتاب کی فصل کتاب اسرار الطہارت کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ رواں ہے مگر بعض مقامات پر توضیحی حاشیوں کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

عرفات زیرِ ادارت: قاضی عبدالقادر، عثمان حیدر، وی۔ پی مصطفیٰ اور محمد صابر۔ شائع کردہ: سیرت کمیٹی پاکستان نیشنل آکلز لمیٹڈ۔ کانٹراوالا بلڈنگ گارڈن روڈ، کراچی۔

گذشتہ سال نزولِ قرآن کی چودہ سو سالہ برسی پر پاکستان نیشنل آئل لمیٹڈ نے قرآن حکیم پر چند قابل قدر مضامین کا یہ مرقع شائع کیا۔ زیرِ تبصرہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ انگریزی اور دوسرا اردو۔ مضامین نگاروں میں دنیائے اسلام کے نامور علما شامل ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال مرحوم۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ سید قطب شہید، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر حمید اللہ، علامہ محمد اسد، مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خورشید احمد اور جناب ماہر القادری۔

طباعت کا معیار بڑا عمدہ ہے۔

WHAT IS OUR MESSAGE | تالیف۔ امام حسن البنا شہید۔ شائع کردہ۔ جناب عزیز احمد بالیبنی۔ صفحات۔ ۳۹۔

اس کتابچے میں احیائے دین کے لیے مسلمانوں اور عام انسانوں کے لیے ایک روح پرور پیغام ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں حسن البنا مرحوم کی اسلام سے غیر معمولی محبت اور اس کی تعلیمات پر غیر متزلزل اعتقاد جھلکتا ہے اور آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پہاڑی کا وعظ اپنے کانوں سے سن رہا ہے۔ جناب عزیز احمد صاحب نے امام مرحوم کے اس پیغام کو بڑی صحت کے ساتھ انگریزی میں منتقل کیا ہے۔

ترجمہ مختصر شعب الایمان | تالیف شیخ امام ابو جعفر عمر قزوینیؒ۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت، آرام باغ، کراچی۔

زیرِ تبصرہ کتابچہ امام بیہقی کی مشہور کتاب شعب الایمان کی تلخیص اور ترجمہ ہے۔ اس میں ایمان کی ۷۷ شاخوں کا تفصیلی بیان درج ہے۔ یہ کتاب دینی نقطہ نظر سے بڑی مفید ہے اور عقیدہ و عمل کی پاکیزگی کے لیے اس سے بہت اچھی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم | تالیف: جناب اسعد گیلانی صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ بتول۔ اچھرہ۔ لاہور۔ قیمت ۵۰ پیسے سفید کاغذ۔ ۳۱ پیسے اخباری کاغذ۔ صفحات: ۵۵

اسعد گیلانی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جہاں ادب و انشاء کی خوبیوں سے بہرہ مند فرمایا وہاں انہیں اس بات

کی بھی قدرت عطا کی ہے کہ وہ ادق موضوعات کو نہایت سادہ انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اس خوبی کے جوہر اس کتاب میں پوری طرح نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے فنی پیچیدگیوں سے ہٹ کر اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی صراحت کی ہے۔

یہ کتابچہ اس قابل ہے کہ عوام میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

فری میسن تحریک

ایک خطرناک، اسلام دشمن، خفیہ، بین الاقوامی یہودی تنظیم

از

مصباح الاسلام فاروقی

فری میسن تحریک کی یہودی بنیادوں، یہودی فکر و عقائد اور یہودی نظامِ کار اور مقاصد کے ناقابلِ تردید شواہد خود ان کی اپنی معتمد ترین کتب کے حوالوں سے پیش کیے گئے ہیں۔

اس موضوع پر دو سو سے زائد کتب کا حاصلِ مطالعہ

درجنوں خفیہ دستاویزات اور متعدد نایاب کتب کا نچوڑ۔ دستاویزی ثبوت کے لیے متعدد فوٹوگراف اور فوٹو اسٹیٹ، چارٹ نقشے، خفیہ نشانات اور نقوش کا عکس، عہدیداروں کے بیج، پوشاکیں اور تمغے ان کی خفیہ زبان اور مخصوص لٹریچر کی نوعیت، فری میسن ہالوں کے اندر کا نقشہ اور وہاں کیا کارروائی کی جاتی ہے۔ اندر کی وہ روداد جو ابتدائی ڈگریوں کے فری میسن بھی نہیں جانتے اور تقریباً تمام پاکستانی مسلمان فری میسن ابتدائی تین ڈگریوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

یہ صرف ایک کتاب نہیں، دستاویز ہے۔ اردو میں پہلی بار

قبل اشاعت رعایتی قیمت: عام ایڈیشن: سات روپے۔ خاص ایڈیشن: بارہ روپے۔ رعایتی قیمت کی وصولی پیشگی ۱۵ اپریل ۶۹ء تک ہے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: مصباح الاسلام فاروقی ۱۵/C/۶ منصورہ کراچی ۳۸

فون نمبر : ۲۵۰۰۷

◎ عالمِ اسلام کی فلاح

◎ سُرخ سامراج میں ہے نہ سفید سامراج میں

◎ اس کی فلاح صرف اِسلام میں ہے

عالمِ اِسلام اور اس کے افکار و مسائل

مرتبہ

خلیل احمد حامدی

میں

عالمِ اِسلام کے موجودہ مسائل اور افکار کا مفصّل اور بے لاگ تجزیہ کیا گیا ہے

عالمِ اِسلام کو سمجھنے کیلئے ایک بے نظیر کتاب

◎ اعلیٰ ایڈیشن	◎ صفحات	◎ سستا ایڈیشن
-/۷ روپے	۳۸۴	-/۵ روپے

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور

۱۶-بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ